szlibrary.wordpress.com

اورنگ زیب قاسمی

Senior Subject Specialist GHSS Zaimdara Dir

"Taraqqi Pasand Tanqeed ke Aham Nazaryati Mabahis"

ABSTRACT

Thesis

Submitted for the Award of the Degree of

Doctor of Philosophy

in

Urdu

Under the Supervision of
Dr. Shahabuddin (Saqib)

By:
Md. Naushad Ahmad

Department of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh-202002 (U.P.) INDIA

2010

تلخیص

ترقی پسند تنقید کے اہم نظریاتی مباحث

نگراں
ڈاکٹر شہاب الدین (ثاقبؔ)

مقالہ نگار
محمد نوشاد احمد

شعبۂ اردو
علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ
۲۰۱۰ء

تلخیص

وقت اور حالات کے پیش نظر زندگی کے ہر شعبے میں تغیر و تبدل کا عمل جاری رہتا ہے۔ ادب بھی انسانی سماج کا ایک اہم شعبہ ہے اس لئے اس میں بھی فی زمانہ تبدیلی اور بدلاؤ کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ تاریخ ادب اردو پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ کئی تحریکات و رجحانات اپنے وقت میں شدو مد کے ساتھ چھائے رہے، لیکن آگے چل کر دس پندرہ برسوں کے اندر ہی ادبی منظر نامے سے غائب ہو گئے یا اپنا اثر تیزی سے کھوتے چلے گئے۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ رجحانات جب منصۂ شہود پر آتے ہیں تو پرانے رجحانات ونظریات ماند پڑنے لگتے ہیں۔ ہر زمانے میں نئی نسل اپنے ساتھ کچھ نیا لے کر آتی ہے اور چونکہ اس کے پاس بھی جواز اور دلائل کی کمی نہیں ہوتی اس لئے وہ بھی اپنے نقطہ نظر کو مستحکم کرنے میں مصروف ہو جاتی ہے۔ اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ پھر کوئی دوسری نسل پورے آب تاب کے ساتھ سامنے نہ آجائے۔

اردو ادب میں اس کی مثال دور ابہام گوئی کے علاوہ اصطلاح زبان، فورٹ ولیم کالج، علی گڑھ تحریک، نظم جدید کی تحریک رومانیت، ترقی پسند تحریک اور جدیدیت وغیرہ سے دی جاسکتی ہے۔ ان تحریکات ونظریات میں ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کا زمانہ بہت پرانا نہیں ہے۔ ترقی پسندی، قدامت پرستی اور رومانیت کی رد میں سامنے آئی۔ ترقی پسند ادیبوں اور ناقدوں نے مارکسی نظریات کی حمایت (نظری اور عملی) کی مزدوروں محنت کشوں اور Exploited طبقہ کی حمایت ادب کا اصل مقصد اور نصب العین ٹھہرا۔ سرمایہ داروں اور رجعت پسندوں کے خلاف نعرے بلند ہوئے۔ سماجی عوامل اور خارجی احوال کو اولیت دی گئی۔ انسان کے انفرادی جذبات و احساسات نظر انداز کئے گئے۔ اس تحریک کا چونکہ براہ راست تعلق دبے کچلے عوام سے تھا اس لئے انفرادیت کی جگہ اجتماعیت اور اجتماع کو فوکس کیا گیا۔ یہ تحریک اپنی اسی اجتماعیت کے سبب بہت جلد مقبول ہوئی۔ حالانکہ معاشرے میں جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اصلاح اور انصاف کی فضا ہموار کرنے میں پہلے بھی متعدد کوششیں ہو چکی تھیں۔ سرسید، شبلی نعمانی اور نذیر احمد کی

szlibrary.wordpress.com

تحریریں اور پھر باضابطہ علی گڑھ تحریک کی کوششیں ادبی تاریخ میں محفوظ ہیں۔لیکن ان کوششوں سے الگ ترقی پسند تحریک کا اختصاص یہ ہے کہ اس نے باضابطہ ایک مشن کے طور پر اور بہت بڑے پیمانے پر اپنے نظریات وافکار کو ہندستان کی ہر زبان اور ادب میں پہنچایا۔اس تحریک کی تشہیر وتبلیغ صرف تحریری طور پر ہی محدود نہیں تھی بلکہ سجاد ظہیر اور ان کے رفقانے عملی طور پر اس کے نظریات کو ملک کے گوشے گوشے میں پہنچایا اور اقبال، پریم چند اور جواہر لعل نہرو جیسی شخصیات کو اپنا ہم نوا بنایا۔

آغاز میں تحریک کی سرگرمیوں کا غائر مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تعمیر خلوص اور خوشگوار تبدیلی کی خواہاں تھی اور ہندستان کی بیشتر زبانوں کے ادیب اور دانشور اس کی ضرورت اور افادیت کو معاشرے کی فلاح و بہبود کے لئے لازمی سمجھتے تھے اور اس کی حمایت کو اپنا ادبی اور سماجی فریضہ تصور کرتے تھے۔ مارکس، لینن، اینگلز اور ماؤزے تنگ کے نظریات گرچہ ان کے مخصوص ماحول یا زیادہ سے زیادہ فرانس، روس اور یوروپی ممالک سے تعلق رکھتے تھے، لیکن ان نظریات کا اطلاق ہندستانی سماج پر بھی ہوتا تھا۔ ہندستان میں بھی سرمایہ دارانہ نظام کے ظل وجبر کے سلسلے موجود تھے۔ اس لئے ہندستان میں مارکسی نظریات کی حمایت فطری تھی۔لیکن سجاد ظہیر، مجنوں گورکھپوری، عبدالعلیم اور احتشام حسین تک مارکسی نظریات اعتدال اور توازن کے ساتھ عوام میں پہنچتے رہے اور ادب میں مقصدیت اور فنی محاسن دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے۔

لیکن ترقی پسند تحریک کے نظریاتی مباحث میں ایک طبقہ وہ بھی شامل ہوگیا جو ماضی اور ماضی کے ادب پاروں کو رد کرنے لگا اور اختر حسین رائے پوری کی انتہا پسندی کو بڑھاوا دینے لگا۔اور پھر اپنے آخری دور تک پہنچتے پہنچتے تو یہ تحریک کمیونسٹوں کا آلۂ کار بن گئی۔مگر تحریک کے آخری زمانے میں محمد حسن، قمر رئیس اور سید محمد عقیل وغیرہ جیسے معتدل اور متوازن مزاج وآہنگ کے نقادوں نے اس میں روح پھونکنے کی کوشش کی۔ اور اپنے نظریے اور خیالات کی مدد سے اسے موجودہ عہد کے لئے بھی کارگر بنانا چاہا لیکن فطرت کا اصول ہے کہ ہر عروج کو زوال ہوتا ہے اور یہی اس تحریک کے ساتھ بھی ہوا۔لیکن یہاں اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ترقی پسند تحریک نے مارکسی، نظریات کے تحت ادب کے رخ کو موڑا، موضوع،

اسلوب اور فکر کی سطح پر ایسی تبدیلیاں آئیں جس نے ہمارے ادب کو وسعت اور تنوع سے ہمکنار کیا۔ اس لئے تحریک کی بنیادی خصوصیات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس ضمن میں جہاں میرا ناقص مطالعہ کام کرتا ہے ترقی پسند تحریک کے آغاز وارتقا پر اردو ادب میں خاصا کام ہوا ہے۔ اس کے نظریاتی امور پر بھی مباحثے قائم ہوئے ہیں۔ اس مقالے میں میں نے اپنی تحقیق کو ترقی پسند تنقید کے نظریاتی مباحث پر مرکوز رکھا ہے۔ اور اپنے موضوع کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے تا کہ تمام سیاق وسباق کے ساتھ تنقید کے نظریاتی مباحث حتی المقدور سامنے آئیں۔

باب اول میں میں نے ''ادبی تنقید کے اصول اور طریقہ کار کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ میری دانست میں ادبی تنقید خواہ عملی ہو یا نظریاتی، اس کا تعلق خواہ کسی علم یا صنف سے ہو اس میں تنقید نگار کا اپنا نظریہ اور فلسفہ موجود ہوتا ہے۔ اور انہیں بنیادوں پر ادبی تنقید آگے کا راستہ طے کرتی ہے۔ ادبی تنقید تاثراتی اور جمالیاتی تنقید سے الگ ایک سائنسی اور منطقی استدلال کے تحت چلتی ہے اور فن پارے کے تجزیے کے دوران بالکل معروضی Detached انداز اپناتی ہے۔ ظاہر ہے اس کے لئے طریقہ کار بھی بالکل جداگانہ ہوتا ہے۔ جو کسی بھی جذباتیت اور غیر منطقی امور کو خاطر میں نہیں لاتا۔

باب دوم ''تنقید کے مختلف دبستان'' کا احاطہ کرتا ہے۔ اردو تنقید میں دبستانی تقسیم کا آغاز بہت بعد میں ہوا۔ مغرب کے زیر اثر اردو میں مختلف نظریات وافکار تو نظر آتے ہیں لیکن مغرب کی طرح یہاں باضابطہ دبستانی اصطلاحات نظر نہیں آتیں۔ لیکن آگے چل کر اصطلاح سازی ہوتی ہے اور مختلف تنقیدی دبستان منصۂ شہود پر آتے ہیں۔ اس باب میں میں نے مغرب اور اردو میں رائج (یا مستعمل) مختلف دبستانوں کے آغاز اور ارتقا کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

باب سوم میں ترقی پسند تحریک کے سیاسی، سماجی اور ادبی پس منظر کو اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے تا کہ اس تحریک کے آغاز کا پس منظر پوری طرح منعکس ہو کر سامنے آجائے۔

اس مقالے کا کلیدی باب باب چہارم ہے۔ یہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ ترقی پسند تنقید کے اہم نظریاتی مباحث ہے جبکہ دوسرا حصہ ترقی پسند تنقید کا عہد بہ عہد ارتقا ہے۔ پہلے حصے میں میں نے مقدور

بھر یہ کوشش کی ہے کہ ترقی پسند تنقید کے اہم نظریاتی مباحث سامنے آجائیں اس کے اس نظریے کے تمام اہم نکات اوران پر مثبت و منفی تاثرات وردعمل کو واضح کرنے کی سعی کی گئی ہے۔اس باب کے دوسرے حصے میں ترقی پسند تنقید کی مرحلہ وار ارتقائی صورت حال کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس باب میں ترقی پسند تحریک سے قبل اردو میں تنقید کی روایت اور تاریخ کو مختصراً پیش کرتے ہوئے جدید ترین دور میں اس رجحان کے اثرات کو بھی نشان زد کیا گیا ہے۔

باب پنجم اردو کے ترقی پسند (مارکسی) ناقدین کے نظریات اوران کی عملی تنقیدات کے جائزے پر مشتمل ہے۔اس باب میں اختر حسین رائے پوری سے لے کر عہد حاضر کے باحیات ترقی پسند نقاد سید محمد عقیل تک تقریباً بارہ اشخاص کا ذکر کیا گیا ہے۔نیز ان کے نظریے پر تجزیاتی اور تحقیقی نظر ڈالی گئی ہے۔مقالے کے اخیر میں اختتامیہ کے تحت گزشتہ سارے ابواب کی روشنی میں نتائج اخذ کرنے کی سعی کی گئی ہے۔اور ترقی پسند تنقید کے نظریاتی مباحث کی بابت بعض اہم نکات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مقدمہ	:		۴
باب اول	:	ادبی تنقید کے اصول اور طریقۂ کار	۱۴
باب دوم	:	تنقید کے مختلف دبستان	۳۳
باب سوم	:	ترقی پسند تحریک کا سیاسی، سماجی اور ادبی پس منظر	۸۱
باب چہارم	:		۱۰۶
		(الف) ترقی پسند تنقید کے اہم نظریاتی مباحث	
		(ب) ترقی پسند تنقید کا عہد بہ عہد ارتقا	
باب پنجم	:	ترقی پسند نقاد	۱۵۶
		اختتامیہ	۲۴۹
		کتابیات	۲۵۸

 szlibrary.wordpress.com

کتابیات

ادب اور انقلاب	اختر حسین رائے پوری	فاروقی پریس، بمبئی	ب۔ت
ادب اور ابہام	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید	نیشنل بک ہاؤس، حیدر آباد	۱۹۷۹ء
ادب اور تنقید	اسلوب احمد انصاری	سنگم پریس، الٰہ آباد	۱۹۶۸ء
ادبی سماجیات	محمد حسن	مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی	۱۹۸۳ء
ادبی تنقید	ڈاکٹر محمد حسن	ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ	۱۹۵۴ء
ادبی تنقید کے چند مسائل	اسلوب احمد انصاری	آزاد کتاب گھر، دہلی	ب۔ت
اردو ادب کے رجحانات پر ایک نظر	ڈاکٹر عبدالعلیم	۔ ۔ ۔	۔ ۔
اردو تنقید اور قمر رئیس	سلیمان اطہر جاوید	(مشمولہ قمر رئیس ایک زندگی)	
اردو تنقید پر ایک نظر	کلیم الدین احمد	بک امپوریم، پٹنہ	۲۰۰۱ء
اردو تنقید کے معمار	ایم حبیب خان (مرتب)	انڈین بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۶۵ء
اردو کے نئے تنقیدی دبستان	ڈاکٹر نیلوفر مرتضی	۔ ۔ ۔	۲۹۹۵ء
اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمٰن اعظمی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی	۱۹۶۶ء
اردو میں ترقی پسند تنقید	ڈاکٹر مخمور صدری	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۰۸ء
اردو ہندی، ہندستانی	سجاد ظہیر	کتب پبلشرز لمٹیڈ، بمبئی	۔ ۔
اشارات تنقید	سید عبداللہ	جمال پریس، دہلی	ب۔ت
افادی ادب	اختر انصاری	آزاد کتاب گھر، دہلی	۱۹۵۹ء
افادات مہدی	مہدی افادی	سلطان بک ڈپو، حیدر آباد	۱۹۵۶ء
ادب کے مادّی نظریے	ظہیر کاشمیری	کلاسیک پبلی کیشن، لاہور	۱۹۷۵ء

انتقادات۔جلد دوم	نیاز فتح پوری	برقی پریس، حیدرآباد	۱۹۴۴ء
پاکستان میں اردو تنقید کے پچاس سال	شہزاد منظر	منظر پبلی کیشنز، گلشن اقبال، کراچی	۱۹۹۶ء
پردیسی کے خطوط	مجنوں گورکھپوری	ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ	۱۹۵۷ء
ترقی پسند ادب	عزیز احمد	ادارہ اشاعت اردو، حیدرآباد	۱۹۴۲ء
ترقی پسند ادب	علی سردار جعفری	انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ	۱۹۵۱ء
ترقی پسند تحریک۔سفر در سفر	پروفیسر علی احمد فاطمی	ادارہ نیا سفر۔الہ آباد	۲۰۰۶ء
ترقی پسند تحریک اور قمر رئیس	محمد شہاب الدین	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۰۴ء
ترقی پسند تنقید	تنویر خانم	تخلیق کدہ۔شاہ عالم گیٹ، لاہور	۱۹۸۴ء
ترقی پسند تنقید کا ارتقا اور احتشام حسین	شمیمہ بیگم	اردو اکیڈمی، سندھ کراچی	۱۹۸۷ء
تلاش و توازن	قمر رئیس	خرام پبلی کیشنز، دہلی	۱۹۶۸ء
تنقید اور اصول تنقید	عبادت بریلوی	ادارۂ ادب و تنقید، لاہور	۱۹۸۴ء
تنقید اور انداز نظر	سیدہ جعفر	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	۱۹۴۹ء
تنقید اور عصری آگہی	سید محمد عقیل	انجمن تہذیب نو، الہ آباد	۱۹۷۶ء
تنقیدی اصول اور نظریے	حامد اللہ افسر	انوار بک ڈپو، لکھنو	۱۹۵۴ء
تنقیدی جائزے	احتشام حسین	رزاقی مشین پریس حیدرآباد	۱۹۴۴ء
تنقیدی دبستان	سلیم اختر	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۸۲ء
تنقیدی حاشیے	آل احمد سرور	ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ	۱۹۴۲ء
تنقیدی مسائل	ریاض احمد	استقلال پریس لاہور	۱۹۶۱ء
تنقیدی مطالعے	شارب ردولوی	لکھنؤ	۱۹۸۴ء
تنقیدی نظریات	پروفیسر احتشام حسین	ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ	۱۹۶۶ء
جدید اردو تنقید: اصول و نظریات	ڈاکٹر شارب ردولوی	اتر پردیش اردو اکادمی۔لکھنؤ	۱۹۸۱ء

ذکر حافظ	سجاد ظہیر	انجمن ترقی اردو (ہند)، علی گڑھ	۱۹۵۶ء
سماجی تنقید اور تنقیدی عمل	محمد عقیل رضوی	تہذیب نو پبلی کیشنز، الہ آباد	۱۹۸۰ء
شناسا چہرے	محمد حسن	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۷۹ء
عرض ہنر	محمد حسن	نصرت پبلیشرز، لکھنؤ	۱۹۷۷ء
فن تنقید اور اردو تنقید نگاری	نورالحسن نقوی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۰۱ء
قمر رئیس کی علمی و ادبی خدمات (تنقیدی جائزہ)	مسرت جہاں	سلور لائن پرنٹرز، حیدر آباد	۲۰۰۴ء
مارکسزم اور ادب	ہندوستانی زبانوں کا مرکز	جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی	۱۹۸۱ء
محاسن کلام غالب	عبدالرحمٰن بجنوری	انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد	۱۹۲۵ء
مراسلات رسوا	مرزا ہادی رسوا/مرتبہ محمد حسن	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۶۱ء
مقدمہ شعر و شاعری	الطاف حسین حالی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۷۷ء
نئے تنقیدی گوشے	ممتاز حسین	آزاد کتاب گھر، دہلی	۱۹۶۴ء
نئی فکریں	سید محمد عقیل رضوی	انجمن تہذیب نو پبلی کیشنز، الہ آباد	۱۹۸۰ء

1. Ashort history of modern Criticism Vol. II Janathan Cape, London,.1970

2. English literary criticism: 17th & 18th century by Dr. Arkins

3. Frontiers of criticism. T.S. Eliot

4. Life and literature. Maxim Gorkey

5. Preface to the Renaissnce by Walter Peter, London.1928

6. Principles of criticism by I.A. Richards London, 1970

7. The firstline of the Vol. of work Endymion, 1818 by Keats

8. The Critics of artist intentions by Oscar Wilde,London,1947

9. Literary criticism. A short history by William K.Winsatt & Cleanth Brooks

10. Literary Criticism by Ramawadh Dwidi & Vikramaditya Raj (Introduction)

11. Macvlajs Essays on Milton, Edited by Harinath Dacca 1902

رسائل

آج کل (ماہنامہ)	دہلی	جولائی	۲۰۱۰ء
الفاظ (دوماہی)	علی گڑھ	جنوری	۱۹۸۳ء
ایوان اردو (ماہنامہ)	دہلی	مئی	۱۹۸۸ء
شاعر (ماہنامہ)	ممبئی		۱۹۶۷ء
شاعر (ماہنامہ)	ممبئی جلد:۴۶،شمارہ:۸۔۷		
شاہکار (احتشام حسین نمبر)	وارانسی	نومبر ودسمبر	۱۹۷۳ء
عالمی اردو ادب	دہلی، جلد۔نمبر۱۹		۲۰۰۱ء
عصری ادب	(مدیر محمد حسن)	جنوری، اپریل، اکتوبر	۱۹۸۰ء
کہسار (ماہنامہ)	بھاگلپور مناظر عاشق ہرگانوی	جنوری	۱۹۷۹ء
گفتگو	ممبئی، ترقی پسند ادب نمبر۔سجاد ظہیر۔یادیں		۱۹۸۰ء
ماہ نو	(اردو تنقید کے پچاس سال)	جنوری	۱۹۸۸ء
نئی نسلیں	کراچی	اکتوبر	۱۹۷۸ء
نیا ادب	لکھنو	جنوری۔فروری	۱۹۴۱ء
نیا پیام (پندرہ روزہ)	لاہور،	اگست	۱۹۷۴ء

●●●

اورنگ زیب قاسمی
szlibrary.wordpress.com

"Taraqqi Pasand Tanqeed ke Aham Nazaryati Mabahis"

Thesis
Submitted for the Award of the Degree of
Doctor of Philosophy
in
Urdu

Under the Supervision of
Dr. Shahabuddin (Saqib)

By:
Md. Naushad Ahmad

Department of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh-202002 (U.P.) INDIA
2010

ترقی پسند تنقید کے اہم نظریاتی مباحث

(مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی)

نگراں
ڈاکٹر شہاب الدین (ثاقبؔ)

مقالہ نگار
محمد نوشاد احمد

شعبۂ اردو

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

۲۰۱۰ء

اورنگ زیب قاسمی

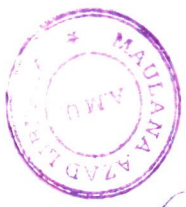

T-8553

T8553

Department of Urdu

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY, ALIGARH – 202002 (INDIA)

Dated: 09.07.2010

CERTIFICATE

This is to certify that the Ph.D. thesis of ***Mr. Md. Naushad Ahmad*** entitled ***"Taraqqi Pasand Tanqeed Ke Aham Nazaryati Mabahis"*** is an original work, and it can be submitted for the award of the Ph.D. degree.

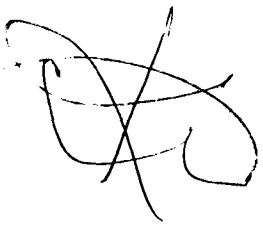

(Prof. Khursheed Ahmad)
Chairman

10.7.10

(Dr. Shahabuddin)
Supervisor

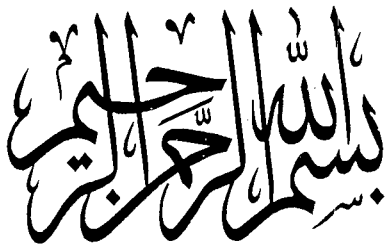
بسم الله الرحمن الرحیم

ترتیب

مقدمہ	:		۴
باب اول	:	ادبی تنقید کے اصول اور طریقۂ کار	۱۴
باب دوم	:	تنقید کے مختلف دبستان	۳۳
باب سوم	:	ترقی پسند تحریک کا سیاسی، سماجی اور ادبی پس منظر	۸۱
باب چہارم	:		۱۰۶
		(الف) ترقی پسند تنقید کے اہم نظریاتی مباحث	
		(ب) ترقی پسند تنقید کا عہد بہ عہد ارتقا	
باب پنجم	:	ترقی پسند نقاد	۱۵۶
		اختتامیہ	۲۴۹
		کتابیات	۲۵۸

☆

مقدمہ

وقت اور حالات کے پیش نظر زندگی کے ہر شعبے میں تغیر و تبدل کا عمل جاری رہتا ہے۔ ادب بھی انسانی سماج کا ایک اہم شعبہ ہے اس لئے اس میں بھی فی زمانہ تبدیلی اور بدلاؤ کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ تاریخ ادب اردو پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ کئی تحریکات و رجحانات اپنے وقت میں شد و مد کے ساتھ چھائے رہے، لیکن آگے چل کر دس پندرہ برسوں کے اندر ہی ادبی منظر نامے سے غائب ہو گئے یا اپنا اثر تیزی سے کھوتے چلے گئے۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ رجحانات جب منصۂ شہود پر آتے ہیں تو پرانے رجحانات و نظریات ماند پڑنے لگتے ہیں۔ ہر زمانے میں نئی نسل اپنے ساتھ کچھ نیا لے کر آتی ہے اور چونکہ اس کے پاس بھی جواز اور دلائل کی کمی نہیں ہوتی اس لئے وہ بھی اپنے نقطہ نظر کو مستحکم کرنے میں مصروف ہو جاتی ہے۔ اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ پھر کوئی دوسری نسل پورے آب تاب کے ساتھ سامنے نہ آجائے۔

اردو ادب میں اس کی مثال دور ایہام گوئی کے علاوہ اصطلاح زبان، فورٹ ولیم کالج، علی گڑھ تحریک، نظم جدید کی تحریک رومانیت، ترقی پسند تحریک اور جدیدیت وغیرہ سے دی جاسکتی ہے۔ ان تحریکات و نظریات میں ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کا زمانہ بہت پرانا نہیں ہے۔ ترقی پسندی، قدامت

پرستی اور رومانیت کی رد میں سامنے آئی۔ ترقی پسند ادیبوں اور ناقدوں نے مارکسی نظریات کی حمایت (نظری اور عملی) کی مزدوروں محنت کشوں اور Exploited طبقہ کی حمایت ادب کا اصل مقصد اور نصب العین ٹھہرا۔ سرمایہ داروں اور رجعت پسندوں کے خلاف نعرے بلند ہوئے۔ سماجی عوامل اور خارجی احوال کو اولیت دی گئی۔ انسان کے انفرادی جذبات و احساسات نظر انداز کئے گئے۔ اس تحریک کا چونکہ براہ راست تعلق دبے کچلے عوام سے تھا اس لئے انفرادیت کی جگہ اجتماعیت اور اجتماع کو فوکس کیا گیا۔ یہ تحریک اپنی اسی اجتماعیت کے سبب بہت جلد مقبول ہوئی۔ حالانکہ معاشرے میں جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اصلاح اور انصاف کی فضا ہموار کرنے میں پہلے بھی متعدد کوششیں ہو چکی تھیں۔ سرسید، شبلی نعمانی اور نذیر احمد کی تحریریں اور پھر باضابطہ علی گڑھ تحریک کی کوششیں ادبی تاریخ میں محفوظ ہیں۔ لیکن ان کوششوں سے الگ ترقی پسند تحریک کا اختصاص یہ ہے کہ اس نے باضابطہ ایک مشن کے طور پر اور بہت بڑے پیمانے پر اپنے نظریات و افکار کو ہندستان کی ہر زبان اور ادب میں پہنچایا۔ اس تحریک کی تشہیر و تبلیغ صرف تحریری طور پر ہی محدود نہیں تھی بلکہ سجاد ظہیر اور ان کے رفقا نے عملی طور پر اس کے نظریات کو ملک کے گوشے گوشے میں پہنچایا اور اقبال، پریم چند اور جواہر لعل نہرو جیسی شخصیات کو اپنا ہم نوا بنایا۔

آغاز میں تحریک کی سرگرمیوں کا غائر مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تعمیر خلوص اور خوشگوار تبدیلی کی خواہاں تھی اور ہندستان کی بیشتر زبانوں کے ادیب اور دانشور اس کی ضرورت اور افادیت کو معاشرے کی فلاح و بہبود کے لئے لازمی سمجھتے تھے اور اس کی حمایت کو اپنا ادبی اور سماجی فریضہ تصور کرتے

تھے ۔ مارکس ،لینن ،اینگلز اور ماؤزے تنگ کے نظریات گرچہ ان کے مخصوص ماحول یا زیادہ سے زیادہ فرانس، روس اور یوروپی ممالک سے تعلق رکھتے تھے ،لیکن ان نظریات کا اطلاق ہندستانی سماج پر بھی ہوتا تھا۔ ہندستان میں بھی سرمایہ دارانہ نظام کے ظل وجبر کے سلسلے موجود تھے۔ اس لئے ہندستان میں مارکسی نظریات کی حمایت فطری تھی۔لیکن سجاد ظہیر، مجنوں گورکھپوری ،عبدالعلیم اور احتشام حسین تک مارکسی نظریات اعتدال اور توازن کے ساتھ عوام میں پہنچتے رہے اور ادب میں مقصدیت اور فنی محاسن دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے۔

لیکن ترقی پسند تحریک کے نظریاتی مباحث میں ایک طبقہ وہ بھی شامل ہوگیا جو ماضی اور ماضی کے ادب پاروں کو رد کرنے لگا اور اختر حسین رائے پوری کی انتہا پسندی کو بڑھاوا دینے لگا۔اور پھر اپنے آخری دور تک پہنچتے پہنچتے تو یہ تحریک کمیونسٹوں کا آلۂ کار بن گئی۔مگر تحریک کے آخری زمانے میں محمد حسن ،قمر رئیس اور سید محمد عقیل وغیرہ جیسے معتدل اور متوازن مزاج وآہنگ کے نقادوں نے اس میں روح پھونکنے کی کوشش کی۔ اور اپنے نظریے اور خیالات کی مدد سے اسے موجودہ عہد کے لئے بھی کارگر بنانا چاہا لیکن فطرت کا اصول ہے کہ ہر عروج کو زوال ہوتا ہے اور یہی اس تحریک کے ساتھ بھی ہوا۔لیکن یہاں اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ترقی پسند تحریک نے مارکسی ،نظریات کے تحت ادب کے رخ کو موڑا ،موضوع، اسلوب اور فکر کی سطح پر ایسی تبدیلیاں آئیں جس نے ہمارے ادب کو وسعت اور تنوع سے ہمکنار کیا۔اس لئے تحریک کی بنیادی خصوصیات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اس ضمن میں جہاں میرا ناقص مطالعہ کام کرتا ہے ترقی پسند تحریک کے آغاز وارتقا پر اردو ادب میں خاصا کام ہوا ہے۔ اس کے نظریاتی امور پر بھی مباحثے قائم ہوئے ہیں۔ اس مقالے میں میں نے اپنی تحقیق کو ترقی پسند تنقید کے نظریاتی مباحث پر مرکوز رکھا ہے۔ اور اپنے موضوع کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے تا کہ تمام سیاق وسباق کے ساتھ تنقید کے نظریاتی مباحث حتی المقدور سامنے آئیں۔

باب اول میں میں نے ''ادبی تنقید کے اصول اور طریقہ کار کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ میری دانست میں ادبی تنقید خواہ عملی ہو یا نظریاتی، اس کا تعلق خواہ کسی علم یا صنف سے ہو اس میں تنقید نگار کا اپنا نظریہ اور فلسفہ موجود ہوتا ہے۔ اور انہیں بنیادوں پر ادبی تنقید آگے کا راستہ طے کرتی ہے۔ ادبی تنقید تاثراتی اور جمالیاتی تنقید سے الگ ایک سائنسی اور منطقی استدلال کے تحت چلتی ہے اور فن پارے کے تجزیے کے دوران بالکل معروضی Detached انداز اپناتی ہے۔ ظاہر ہے اس کے لئے طریقہ کار بھی بالکل جداگانہ ہوتا ہے۔ جو کسی بھی جذباتیت اور غیر منطقی امور کو خاطر میں نہیں لاتا۔

باب دوم ''تنقید کے مختلف دبستان'' کا احاطہ کرتا ہے۔ اردو تنقید میں دبستانی تقسیم کا آغاز بہت بعد میں ہوا۔ مغرب کے زیر اثر اردو میں مختلف نظریات وافکار تو نظر آتے ہیں لیکن مغرب کی طرح یہاں باضابطہ دبستانی اصطلاحات نظر نہیں آتیں۔ لیکن آگے چل کر اصطلاح سازی ہوتی ہے اور مختلف تنقیدی دبستان منصۂ شہود پر آتے ہیں۔ اس باب میں میں نے مغرب اور اردو میں رائج (یا مستعمل) مختلف دبستانوں کے آغاز اور ارتقا کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

باب سوم میں ترقی پسند تحریک کے سیاسی، سماجی اور ادبی پس منظر کو اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے تا کہ اس تحریک کے آغاز کا پس منظر پوری طرح منعکس ہو کر سامنے آجائے۔

اس مقالے کا کلیدی باب باب چہارم ہے۔ یہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ ترقی پسند تنقید کے اہم نظریاتی مباحث ہے جبکہ دوسرا حصہ ترقی پسند تنقید کا عہد بہ عہد ارتقا ہے۔ پہلے حصے میں میں نے مقدور بھر یہ کوشش کی ہے کہ ترقی پسند تنقید کے اہم نظریاتی مباحث سامنے آجائیں اس کے اس نظریے کے تمام اہم نکات اور ان پر مثبت و منفی تاثرات و ردعمل کو واضح کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اس باب کے دوسرے حصے میں ترقی پسند تنقید کی مرحلہ وار ارتقائی صورت حال کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس باب میں ترقی پسند تحریک سے قبل اردو میں تنقید کی روایت اور تاریخ کو مختصراً پیش کرتے ہوئے جدید ترین دور میں اس رجحان کے اثرات کو بھی نشان زد کیا گیا ہے۔

باب پنجم اردو کے ترقی پسند (مارکسی) ناقدین کے نظریات اور ان کی عملی تنقیدات کے جائزے پر مشتمل ہے۔ اس باب میں اختر حسین رائے پوری سے لے کر عہد حاضر کے باحیات ترقی پسند نقاد سید محمد عقیل تک تقریباً بارہ اشخاص کا ذکر کیا گیا ہے۔ نیز ان کے نظریے پر تجزیاتی اور تحقیقی نظر ڈالی گئی ہے۔ مقالے کے اخیر میں اختتامیہ کے تحت گزشتہ سارے ابواب کی روشنی میں نتائج اخذ کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اور ترقی پسند تنقید کے نظریاتی مباحث کی بابت بعض اہم نکات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ان تمہیدی کلمات کے بعد میں صمیم قلب کے ساتھ یہ اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ میں اس نہایت اہم

اور دقت طلب موضوع پر کام کرنے کا اہل نہیں تھا۔لیکن میرے نگراں استاذی ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب صاحب نے میرے مقالے کی تکمیل میں نہایت ہی حقیقت کے ساتھ میری رہنمائی کی۔میں ان کی رہنمائی اور محبت کو فراموش نہیں کرسکتا۔اللہ ایسے اساتذہ ہر طالب علم کو میسر فرمائے۔آمین۔

میں خاص طور سے پروفیسر ابوالکلام قاسمی صاحب کا ذکر کرنا چاہوں گا۔انہوں نے ایک عرصے تک مجھے اپنی پدرانہ شفقت سے نوازا ساتھ ہی ہر مرحلے پر انہوں نے نہ صرف میری رہنمائی کی بلکہ مجھے ہر مشکل اور الجھن سے بھی بچایا۔ایسے اساتذہ قسمت سے ملتے ہیں۔اور اس معاملے میں میں خود کو خوش قسمت سمجھتا ہوں ۔پروفیسر خورشید احمد چیرمین صدر شعبہ اردو علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے تئیں میں اپنی ممنونیت کا اظہار نہ کروں تو یہ ناسپاسی ہوگی۔ان کے محبت بھرے سلوک اور مشوروں سے میں نے ہمیشہ استفادہ کیا ہے۔شعبہ اردو علیگڑھ کے میرے سینئرز اور جونیئر برادران میں ڈاکٹر محمد علی جوہر ڈاکٹر ابوصالح، ڈاکٹر امتیاز احمد ڈاکٹر خالد سیف اللہ، ڈاکٹر سراج اجملی ،حقانی القاسمی ،خواجہ جاوید اختر ،جنید احمد میرے اچھے برے وقتوں کے گواہ اور مونس وغم خوار رہے ہیں۔ان کی یادیں میرے لئے سرمایہ حیات ہیں۔ابوبکر صدیقی اگرچہ میرے چھوٹے بھائی ہیں لیکن انہوں نے بڑے بھائی کا رول ادا کیا۔میرے مقالے کی تیاری میں ابتدا تا حال انہوں نے غیر معمولی دلچسپی دکھائی علی گڑھ کے ہی باب میں ایجوکیشنل بک ہاؤس اور اسکے مالک جناب اسد یار خان صاحب یاد آتے ہیں۔خانصاحب میرے موضوع سے متعلق کتابوں کی دستیابی میں میری ہر وقت مدد کی۔مولانا ابوالکلام آزاد لائبریری میں میرے دوست محمد

محسن نے بھی بہی کام ذرا بڑے پیمانے پر کیا۔اور مجھے اس عظیم کتب خانے سے استفادے کا موقع فراہم کیا۔سید محبّ الحق (لکچرار شعبہ سیاسیات) میرے بھائی میرے دوست بلکہ میرے سب کچھ ہیں۔ انہوں نے میری ہر طرح سے مدد کی۔میں ان کے حسن سلوک کا گرویدہ ہوں۔

میں اپنے والد جناب محمد مقصود احمد مرحوم کو اکثر یاد کرتا ہون اور مغموم ہو جاتا ہوں کہ ان کی شفقت اور پدرانہ محبت کا سایہ تادیر میرے سر پر نہیں رہا۔وہ ایک صوفی منش تھے۔اللہ نے انہیں اپنی مختلف علوم سے نوازا تھا۔میں اپنی کامیابی کو ان کی دعاؤں کی برکت سمجھتا ہوں۔میری والدہ مرحومہ شمیمہ خاتون نے نہ صرف میری پرورش کی بلکہ زندگی کے ہر موڑ پر مجھے ٹوٹنے بکھرنے سے بچایا۔وہ ایک مذہبی خیال کی خاتون تھیں۔ہم سے ان کو شغف تھا۔انہوں نے خود پر مسلسل جبر کیا لیکن مجھے کبھی مایوس نہیں ہونے دیا۔ ایک طرح سے انہوں نے میرے لئے اپنی پوری زندگی نچھاور کردی۔میں آج انہیں یاد کر کے آبدیدہ ہوں۔کاش وہ مجھے آج ملتیں اور میرے مقالے کی تکمیل پر مجھے محبتوں اور دعاؤں سے نوازتیں۔میرے برادران میں محمد نسیم احمد، اظہار احمد، شہزاد احمد، ارشاد احمد، شمشاد احمد نے مجھے ہمہ وقت حوصلہ افزا باتوں سے متحرک رکھا۔میری بہن تمنا بھی آج میری خوشی میں برابر کی شریک ہے۔میرے بڑے سالے اختر حسنین قادری، ارشد حسین قادری اور بالخصوص مبشر حسین بھی میری کامیابی کے برابر شریک ہیں۔

میری اہلیہ شبینہ نسرین کا میری زندگی کی تہذیب و ترتیب میں بڑا کارنامہ رہا ہے۔آج اسی کی بدولت میں اس منزل تک پہنچا ہوں۔اس نے ایک گہرے دوست کا بھی رول ادا کیا ہے اور نا مساعد سے

نامساعد حالات میں میری ہمت بڑھانے اور ڈٹے رہنے کا جذبہ پیدا کیا ہے۔ میں ایسی شریک حیات کو اپنی زندگی کے لئے قدرت کا بیش بہا تحفہ سمجھتا ہوں۔ اپنی اہلیہ کی بڑی بہن ڈاکٹر فرحت یاسمین کو بھی یاد کرنا اپنا خوشگوار فریضہ سمجھتا ہوں۔ میں اپنی خوش دامن جمیلہ خاتون صاحب کے تئیں بھی ممنونیت کا اظہار کرتا ہوں۔

میں اس موقع سے پروفیسر اسلم آزاد اور پروفیسر اعجاز علی ارشد (صدر شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی) کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے موقع بہ موقع اپنے مشوروں سے مستفیض ہونے کا موقع دیا۔ میں اپنے شعبہ کے ہیڈ ڈاکٹر جاوید حیات (صدر شعبہ اردو بی این کالج پٹنہ) کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا کہ انہوں نے ہر موقع پر میری مدد کی۔ مجھے پی ایچ ڈی کر لینے کا ہمیشہ مشورہ دیا۔ جاوید صاحب کی یہ کرم فرمائی مجھے آج بھی حاصل ہے۔ ڈاکٹر عظیم اللہ صاحب، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، ڈاکٹر اسرائیل رضا بھی میرے کرم فرماؤں میں شمار ہوتے ہیں۔

میں اپنے کالج (بی این کالج پٹنہ) کے پرنسپل ڈاکٹر راج کشور پرساد اور دیگر اساتذہ میں ڈاکٹر فیاض احسن، ڈاکٹر ایل پی یادو، ڈاکٹر ابھے پرکاش، ڈاکٹر مرلی شرن مانگلک، ڈاکٹر دلیپ رام، ڈاکٹر شیو ساگر، پروفیسر نورالہدیٰ صاحب، کو بھی یاد کرنا چاہوں گا جنہوں نے میرے ساتھ ہمیشہ تعاون اور ہمدردی کا معاملہ رکھا۔ شعبے کے پیون کرشنا کمار اور سدھیر کمار کی ہمت افزائی بھی میرے لئے کسی طرح کم نہ ثابت ہوئی۔

میری بیٹی ارجمند نوشاد اور حرا نوشاد بھلا اس موقع سے کیسے یاد نہ آئیں۔ ان کی توتلی زبان اور محبت

بھری شرارتوں نے میرے اندر توانائی بھرنے کا کام کیا اور میں ان کی مسکراہٹوں سے ہمیشہ تازہ دم ہوکر آگے بڑھتا رہا۔

ڈاکٹر نسیم احمد نسیم معروف نقاد اور شاعر ہیں۔ وہ میرے بڑے بھائی اور شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سینئر ہیں۔ آج سے ۲۵ سال پہلے انہوں نے جو محبت کا رشتہ مجھ سے جوڑا وہ آج تک قائم ہے۔ اور اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ یہ رشتہ زندگی بھی قائم رہے۔ ان کی رہنمائی اور ان کے علم سے بھی میں نے استفادہ کیا۔ میں ان کے لئے ہمہ وقت دعا گو ہوں۔

اس مقالے کی کمپوزنگ کیلئے میں ایم ٹیک کمپیوٹر کے مالک اور شاعر و ادیب جناب توقیر عالم توقیرؔ کو بھی فراموش نہیں کرسکتا کہ انہوں نے دن رات ایک کر کے نہایت دل جمعی کے ساتھ مقالے کو کمپوز کیا۔

اخیر میں میں یہ اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ خدا کی ذات کے سوا کوئی شے بے عیب نہیں۔ ظاہر ہے میرا مقالہ بھی اس سے مبرا نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا اگر میری کمیوں اور خامیوں کی طرف نشان دہی کی گئی تو میں اس کی روشنی میں خوب سے خوب تر کی تلاش جاری رکھوں گا۔

شکریہ!

(محمد نوشاد احمد)

ادبی تنقید کے اصول اور طریقۂ کار

ادبی تنقید ایک واضح نظریہ اور موقف کا اظہار ہے۔ ادبی تنقید خواہ عملی ہو یا نظریاتی، اس کا تعلق خواہ کسی صنف یا علم سے ہو اس میں تنقید نگار کا اپنا نظریہ اور فلسفہ موجود ہوتا ہے۔ یہ ایک اصول اور ضابطہ کے تحت فن پاروں کی تفہیم اور تجزیہ کا کام انجام دیتی ہے۔ تنقیدی نظریات کسی بھی زمانے میں جامد نہیں رہے ہیں وقت اور تغیرات زمانہ اس کی راہ متعین کرتے ہیں چونکہ وقت اپنے ماحول کا آئینہ ہوتا ہے اس لئے نقاد بھی اس آئینہ کو پیش نظر رکھتا ہے۔ وہ زندگی سے تجربے حاصل کرتا ہے۔ اور فن پاروں کو دیکھنے اور افہام و تفہیم کا طریقہ کار متعین کرنے میں ہمیشہ اپنے نظریے اور موقف کو اولیت دیتا ہے۔ ادبی تنقید تاثراتی تنقید کے برعکس سائنسی اصول پر قائم ہوتی ہے۔ معروضیت، صراحت، وضاحت اور قطعیت اس کے وسیلے ہوتے ہیں۔ ہر زمانے میں جیسا کہ عرض کیا گیا کہ تنقیدی تجربے ہوتے رہتے ہیں اور ردو قبول کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

اس ضمن میں ڈاکٹر عبادت بریلوی رقم طراز ہیں کہ:

''تاریخ تنقید پر ایک نظر ڈالیے تو وہ شروع سے آخر تک تجربے کی

ایک داستان نظر آئے گی۔ ارسطو نے شعر اور ڈرامے کے بارے میں جو نظریات اپنی کتاب فن شاعری (Poetics) میں پیش کئے ہیں وہ بہرحال ایک تجربہ ہیں۔ لان جائی نسن نے جن خیالات کا اظہار (On Suktime) میں کیا ہے۔ ان کے بھی تجربہ ہونے میں کہ شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ دانتے نے جو باتیں اپنی کتاب (Eloguis Valgar) میں کہی ہیں ان میں بھی تجربے کی آواز واضح طور پر سنائی دیتی ہے.....

اسی لئے تو تنقید آج ایک فن بھی ہے علم بھی اور جمالیات بھی فلسفہ بھی اور نفسیات بھی، تاریخ بھی ہے اور عمرانیات بھی۔ علم الاقوام بھی ہے اور معاشیات بھی۔ تہذیب بھی ہے اور سیاسیات بھی۔ غرض انسانی زندگی میں جتنے علوم بھی ہیں وہ ان سب کے مجموعے کا نام ہے۔ ان کی بنیادی اصول کی روشنی میں ادب کے اصول معین کئے ہیں۔ لیکن اپنے آپ کو ادب کے دائرے سے باہر نہیں نکلنے دیا اور یہی تنقید کا سب سے اہم تجربہ ہے۔''[1]

ادبی تنقید کے اصول وضوابط کے وضع ہونے سے پہلے تاثراتی تنقید کا سراغ ملتا ہے۔ ہمارے قدیم تذکروں میں بھی اس نوع کی تنقید بھری پڑی ہے۔ ان میں کسی اصول اور نظریے کو نہیں اپنی ذاتی پسند اور

---

[1] تنقید اور اصول تنقید۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ ص۔ ۶۸۔۶۹

ناپسند کو معیار اور پیمانہ بنایا جاتا تھا۔ لسانی اور فنی (بالخصوص) عروضی مسائل تک تنقیدی خیالات محدود تھے۔ ایک طویل عرصے تک تنقید نے فکر کی جہات اور مختلف علوم کو نہیں اپنایا جس کے سبب اس کی افادیت قائم نہیں ہو پائی۔ لیکن وقت کے ساتھ اردو میں تنقید نے اپنی روش تبدیل کی اور تمام علوم اور دنیا کے بہترین ادب پاروں اور ادبی رجحانات پر غور و فکر کیا اور تنقید کو ایک نیا رخ دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آج تنقید صرف مختلف علوم و فنون سے ہی آگاہ نہیں بلکہ وہ علوم کو برتنے میں سرگرم بھی ہے۔

مغرب میں تنقید کے پس منظر پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں بعض نقادوں نے عام تنقیدی روش کے برخلاف اس میں فکر اور منطق کو داخل کرنا چاہا وہ رومانی نقاد کہلائے، حالانکہ ان کی مخالفت بھی ہوئی لیکن دراصل وہی آگے چل کر نئی تنقید کے علمبردار بنے۔ ان میں ورڈز ورتھ، کولرج، سینٹ بیو وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر مانے جاتے ہیں اور نئی تنقید کے بنیاد گزار بھی تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ان رومانی نقادوں سے پہلے روایتی اور کلاسیکی معیاروں کو حتمی پیمانہ تصور کیا جاتا تھا۔ اس نوع کی تنقید میں کچھ بندھے ٹکے طریقے اور انداز پائے جاتے تھے۔ اس میں نہ کوئی نیا پن، نہ کوئی وسعت اور نہ ہی کوئی آگہی تھی۔ رومانی نقادوں کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے یونانیوں اور رومنوں کے تنقیدی طریقہ کار اور معیار سے انحراف کیا اور انہوں نے اس بات کو ضروری سمجھا کہ ادب کو اپنے معاشرے، قوم اور ملک کا آئینہ ہونا چاہئے۔ نیز اسے عوام کے مزاج اور رجحان کا بھی آئینہ ہونا چاہئے۔ اور تنقید کو بھی انہیں مذکورہ بنیادوں پر استوار ہونا چاہئے۔ اس جدید تنقیدی رجحان کے بنیاد گزاروں میں سینگ سرفہرست تھا۔ سینگ

نے اپنے موقف اور خیال کو اپنی تصنیف ''لاؤ کون'' میں صراحت کے ساتھ وضاحت کر دی ہے اس میں شاعری مصوی اور بت تراشی پر سیر حاصل بحث ہے۔ ہر جگہ اس نے نئے تنقیدی رویے اور رجحان پر زور دیا ہے۔ آگے چل کر سینگ سے اتفاق کرتے ہوئے اس کے کئی ہم خیال بھی سامنے آتے ہیں۔ جنہوں نے تنقید کو نئی سمت اور نئی فکر کو جلا بخشنے میں اہم رول ادا کیا۔

مندرجہ بالا نقادوں کی رو سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ادب میں تنقید کی کلیدی حیثیت ہے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تنقید زندگی سے وابستہ رہتی ہے ۔ ادب کو چھوڑ بھی دیں تو زندگی کے ہر شعبے میں تنقید کا عمل دخل کارفرما نظر آتا ہے۔ تنقید زندگی کے مظاہر کو افہام و تفہیم اور شعور و آگہری سے باخبر ہونے کا واحد ذریعہ ہے۔ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب بھی ایک اہم شعبہ ہے اور شعبہ میں تنقید بھی ہے۔ ادبی تنقید کے فرائض میں یہ ہے کہ وہ زندگی اور فن کی بابت وضاحت اور صراحت کے ساتھ تفہیم کی راہ ہموار کرے۔ تنقید کے یہی فرائض اس کے اصول بھی ہیں اور مقصد بھی ۔ یہ اصول اور مقصد بہت قابل قدر ہیں کیونکہ اسی کے ذریعے زندگی کے تمام عیوب اور اچھائیاں اجاگر ہو کر سامنے آتی ہیں۔ اگر تنقید زندگی کے ان دونوں پہلوؤں سے روگردانی کرے تو یہ کسی کام کی نہیں رہ جائے گی۔ اس سلسلے میں مزید وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

''.....اس کے پیش نظر دو کام ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ جاننا کہ زندگی کو ادب کی کیا ضرورت ہے اس ادب میں زندگی کی صحیح ترجمانی ہے یا نہیں؟

اور دوسرے یہ کہ اس ترجمانی میں دلوں پر اثر کرنے والا انداز کس حد تک پایا جاتا ہے؟ یہ ترجمانی اچھی بھی لگتی ہے یا نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ تنقید بہ یک وقت موضوع اور فن دونوں پر نظر رکھتی ہے۔ اس کے پیش نظر یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ کون سے انسانی مسائل ادبی اور فنی تخلیق میں سموئے گئے ہیں اور اس سلسلے میں کس حد تک جمالیاتی قدروں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ تنقید کے سامنے ان سب کا ایک معیاری اور مثالی تصور ہوتا ہے۔ اور ادب اور فن کو وہ اس تصور کی عینک سے دیکھتی ہے.....

بہر حال تنقید کے پیش نظر انہیں اصولوں معیاروں اور قدروں کی تلاش ہوتی ہے۔ ادبی اور فنی تخلیق تو اس کے نزدیک صرف انہیں معیاروں اور قدروں کی وجہ سے ادبی اور فنی تخلیق ہے۔ یہی سبب ہے کہ انسانی زندگی کی تاریخ کے ہر دور میں جو تنقید پیدا ہوئی ہے اس میں پلہ ان خیالات کا ہی بھاری رہا ہے جو اصولوں اور معیاروں کے بارے میں پیش کئے گئے ہیں۔ یہ اصول اور معیار گویا پیمانے ہیں جن سے ادبی اور فنی تخلیق کو ناپا جاتا ہے۔ ان کے بغیر ادب اور فن کی صحیح اندازہ دانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔.....''[1]

---

[1] تنقید اور اصول تنقید۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ ص۔ ۱۳۔۱۴

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جب تنقید میں معیار اور فلسفیانہ افکار کا ذکر ہوتا ہے تو یہیں سے اصول اور نظری تنقید کا آغاز ہو جاتا ہے۔نظری اور عملی تنقید گرچہ علاحدہ معلوم ہوتے ہیں لیکن دونوں کے درمیان ایک باہمی ربط ہوتا ہے۔اور اسی ربط اور انضباط سے اکثر مقامات پر فن پاروں کی تفہیم ہوتی ہے۔نظریے اپنی جگہ پر کچھ نہیں ہوتے جب تک کہ فن پارے سامنے نہ ہوں۔فن پاروں کو سامنے رکھ کر ہی عملی طور پر تنقیدی خیالات کا اظہار ہوتا ہے اور فن پارے کے مقام و مرتبے کا تعین ہوتا ہے۔اسی طرح عملی تنقید کی بابت ذکر کرتے ہوئے اکثر نظریاتی مباحث اور امثال بھی سامنے رکھے جاتے ہیں۔اس طرح تنقید کے یہ دونوں رخ ایک دوسرے کے سامنے ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔

جیسا کہ درج بالا سطور میں عرض کیا گیا کہ تاثراتی تنقید اور ادبی تنقید دونوں کے درمیان بہت فرق ہے تاثراتی تنقید ذاتی خیالات پر انحصار کرتی ہے جبکہ ادبی تنقید میں معروضیت اور شفافیت ہوتی ہے۔ تاثراتی تنقید میں اکثر نقاد کے جذبات و احساسات منعکس ہوتے ہیں۔اس میں غیر جانب دارانہ انداز نہیں ہوتا۔شعور و آگہی کا فقدان ہوتا ہے۔اس طرح جن نقادوں کو تاریخی عوامل سے دلچسپی ہوتی ہے وہ تاریخ کو ہی اپنی تنقید کا مرکزی محور تصور کرتے ہیں اس طرح ان کی تنقید تاریخی تنقید کے زمرے میں آجاتی ہے۔بعض نقاد عمرانی موضوعات سے شغف رکھتے ہیں اسلئے وہ عمرانی نقاد کہلاتے ہیں اسی طرح نفسیاتی تنقید کا بھی معاملہ ہے۔اس کے وسیلے سے نقاد ادبا شعرا کی نفسیات کا مطالعہ کر کے ان کے ذریعہ خلق کئے گئے ادب پاروں کی تہیں کھولتا ہے اور تفہیم کی نئی راہیں ہموار کرتا ہے لیکن ادبی نقاد ان تمام علوم پر

نظر رکھتا ہے اور بہ یک وقت وہ تمام علوم کا احاطہ کرتے ہوئے فن پاروں کا تجزیہ اور محاسبہ کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ادبی تنقید کا دائرہ کار بہت وسیع ہوتا ہے۔ اس نوع کی تنقید کے ذریعہ ادب کو سمجھنے اس سے محظوظ ہونے اور بصیرت حاصل کرنے کا وافر موقع فراہم ہوتا ہے۔ ادبی تنقید میں تجزیہ اور محاسبہ بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ تجزیے کے دائرے میں تمام معروضی نکات موجود ہوتے ہیں اور اس کو سامنے رکھ کر نقاد جو نتیجہ برآمد کرتا ہے وہی دراصل اس کا نظریہ اور موقف ہوتا ہے۔ یعنی اصولوں کو سامنے رکھے بنا نظریہ اور موقف تک نہیں پہنچا جا سکتا۔ اس لئے تنقید کے لئے کسی نہ کسی اصول اور واضح نظریے کی موجودگی لازمی قرار پاتی ہے۔

ادبی تنقید میں اصول وضوابط کے لزوم کو تقریباً تمام مغربی اور اردو کے اہم ناقدوں نے تسلیم کیا ہے۔ کیونکہ بغیر کسی نقطہ نظر اور نصب العین کے کوئی بھی تنقیدی تحریر بے معنی اور غیر افادی ہوتی ہے۔ چونکہ تنقید کا کام زندگی کی تفہیم بھی ہے اور یہ تفہیم ظاہر ہے ادب میں پیش کئے گئے زندگی کے مختلف عوامل سے تعلق رکھتی ہے اس لئے اس کو بے راہ روی اور ذاتی پسند و ناپسند پر منحصر نہیں ہونا چاہئے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سیدہ جعفر کا یہ اقتباس بہت ہی اہمیت کا حامل ہے:

> ''.....شخصی انداز فکر اور ذاتی پسند اور ناپسند سے پیدا ہونے والی انفرادیت کے باوجود تنقید کے ایک دبستان سے وابستہ تمام نقادوں کا طریقہ فکر چھوٹے چھوٹے اختلافات سے قطع نظر تقریباً یکساں ہوتا ہے

کیونکہ ان کے پیش نظر چند مخصوص اصول وقواعد اور ادبی معیارات ہوتے ہیں۔علم ،شعور، ذوق اور تصور فن کے اعتبار سے قاری کسی ادب پارے کی معنویت کا نقش ابھارتا ہے۔اس وقت مختلف تنقیدی اسالیب رائج ہیں اور ہر اسلوب اور انداز کے تحت بھی چھوٹے بڑے اختلافات کی نمود ہوتی رہتی ہے۔ کیونکہ ادراک حقیقت کے نہج اور ذریعے یکساں نہیں ہوتے تنقیدی نقطہ نظر کا تعلق دراصل اس نظریہ ادب وفن سے ہوتا ہے جس پر نقاد ایقان رکھتا ہے ہو۔بعض کے نزدیک ادب کا مقصد محض تفریح وانبساط اور احساس جمال کی تسکین ہے۔بعض اس خیال کے حامل ہوتے ہیں کہ ادب زندگی کی از سر نو تخلیق ہے۔بعض کا تصور یہ ہے کہ ادب شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے اس لئے ادیب کی نفسیات اور اس کے خیالات کو سمجھنا ضروری ہے۔بعض ادب کو معاشی کشمکش اور مادی حالات کا آفریدہ سمجھتے ہیں اور جدلیاتی رشتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے کسی فن پارے پر نظر ڈالتے ہیں اور انداز نظر کا یہی اختلاف تنقیدی دبستانوں کو جنم دیتا ہے اور تاثراتی تنقید ، مارکسی تنقید، سائنٹفک تنقید، نفسیاتی تنقید، تقابلی تنقید، ہومن ازم اور ہیئت پرستی اور تاریخی تنقید جیسی کئی اصطلاحیں تنقیدی زاویہ نگاہ کے مختلف راستوں

کی نمائندگی کرتی ہیں۔''[1]

ادبی تنقید کے اصولوں کی پابندی کے دوران جیسا کہ عرض کیا گیا ہے تاثراتی تنقید نگار دوسرے نقادوں کی طرح فن پارے کے متعلق فوری طور پر جورائے قائم کرتا ہے اس پر غائر نظر نہیں ڈالتا اور اس کی تنقید خالص اس کے جذبات واحساسات کا ترجمان ہوکر رہ جاتی ہے۔ اس کے برعکس جن کی تنقید تمام خارجی معیار واصول کو پیش نظر رکھتا ہے۔ اس کے یہاں ذاتی آرا کے علاوہ اصولی ضابطے بھی ہوتے ہیں جن سے وہ بندھا ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس کا نقد پارہ اعتدال، توازن اور معروضیت سے معمور ہوتا ہے۔ فکر وفلسفہ اور منطق جب تنقید کے Tools ہوتے ہیں تو معیار خود بخود بلند ہو جاتا ہے۔ ان اوصاف کو ہر صنف کا ناقد اپنے اپنے اطور پر برتنے کا کام کرتا ہے۔ شاعری کی تنقید میں ان نکات کو بطور خاص نظر میں رکھنا از حد ضروری ہے۔ کیونکہ شاعری میں رمز وکنایہ کے ذریعہ شعرا بہت سے ایسے احساسات وخیالات کو پیش کرتے ہیں جو بظاہر کچھ ہوتے ہیں اور بباطن کچھ اور اس لئے شاعری کی تنقید کے اصول اور ضوابط کا اہتمام بہت آسان نہیں۔ اکثر شاعر اپنے تجربات کو اپنے خیالات کے ساتھ ہم آہنگ کرتا ہے اور نتیجے کے طور پر اس کے یہاں جمالیاتی اقدار آتی ہیں۔ اس سلسلے میں لفظوں کا استعمال، تشبیہات واستعارات، زبان کی بندش، بیان کی کشش اور اسلوب کا ستھراپن وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ لیکن یہ تمام چیزیں زیریں طور پر اپنے موضوع کے ساتھ مربوط ہوتی ہیں۔ اس لئے اکثر اہم اور عظیم شعرا

---

[1] تنقید اور انداز نظر۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر۔ ص۔ ۸

ان دونوں اوصاف کو آہنگ کر کے اپنے کلام کو منفرد اور غیر معمولی اہمیت کا حامل بناتے ہیں۔ لیکن جو اس ہم آہنگی کا التزام نہیں کر پاتے، وہ اچھی اور بڑی شاعری سے محروم رہ جاتے ہیں۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی رقم طراز ہیں:

''شاعری کی تنقید کے لئے اس ہم آہنگی کی تلاش اور اس کے مختلف پہلوؤں کی چھان بین ضروری ہے۔ بلکہ اس طرح کہ مجموعی طور پر جو اس کی وحدت ہے اس کا صحیح اندازہ ہو۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب شعر کا نقاد شاعرانہ تجربے اور اس کے جمالیاتی اظہار کی تہہ تک نہیں جائے۔ اس طرح کہ شاعر اور اس کے درمیان کسی قسم کا کوئی فرق باقی نہ رہے۔ ظاہر یہ سب کچھ اسی حالت میں ہوسکتا ہے جب شعر کا نقاد شاعرانہ تجربے کی اسی منزل میں جا پہنچے جہاں سے شاعر نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا تھا۔

..... شاعری کے نقاد کا اس احساس اور جذبے سے جو تخلیق شعر کا باعث بنتا ہے۔ وہی تعلق ہے جو خود شاعر کو ہے۔ اس لئے اس موضوع کے بارے میں اس کا اظہار خیال تخلیقی عمل سے کسی طرح کم نہیں۔ کیونکہ ایسا کرتے ہوئے ایک طرف تو وہ انسانی زندگی کے کسی خاص پہلو پر جذبات کو سامنے رکھ کر اظہار خیال کرتا ہے۔ اور دوسرے اس کے اظہار میں جذبے

اور تخیل کو نمایاں حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اس تجربے میں شاعر کو تنقیدی شعور سے کام لینے کی زیادہ ضرورت پیش آتی ہے۔ تجربے کو صحیح طور پر دیکھنے اس کو محسوس کرنے اور اس پر جمالیاتی اظہار میں وہ بہر حال تنقیدی شعور سے کام لیتا ہے.....''[1]

محولہ اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ناقد کے یہاں جب شعور اور ادراک کا عمل شروع ہوتا ہے تو وہاں لامحالہ اصول اور ضابطے کی کارفرمائی کا آغاز ہو جاتا ہے۔

ایک مغربی دانشور ولیم کے وم سٹ نے افلاطون کے زمانے سے لے کر اب تک کے تنقیدی رویے پر اظہار خیال کرتے ہوئے جہاں ادبی تنقید کے ابتدائی اصول اور مراحل کو منعکس کیا ہے وہیں افلاطون اور دوسرے کئی مشاہیر دانشوروں اور نقادوں کی آراء کا تجزیہ کیا ہے۔ تنقید کی مختصر تاریخ کے ضمن میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ:۔

The present history might have lingered longer near its begining than it actually does with certain proto_ glimpses of literary critical conciousness in the western tradition-

---

[1] تنقید اور اصول تنقید۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ ص۔ ۲۵

invocations by the early Greek poets Homer and Hesiod to the Muses and assertions of an aim to reach or to charm , phrase of some pith and relevance concerning craft genius or the fate of man , from early and all but lost lyric poets, from law -givers, dramatists , and pre-socratic philosophers .....what does Criticism say? The entire course of literary theory and Criticism , from the time of plato to the present has in effect been occupied with producing more or less actue versions of those questions and more or less accurate and relling answers. [1]

1.Literary Criticism . A short History - by William K. Win-satt as Cleanth Brooks.

محولہ اقتباس سے صرف نظر جہاں ادبی تنقید (Literary Criticism) کا ذکر آتا ہے وہاں یہ اصطلاح ایک خاص معنی میں استعمال ہوتی ہے ۔ مغرب میں ادبی تنقید یعنی Literary Criticism ارسطو سے ہی مانا جاتا ہے لیکن باضابطہ طور پر T.S.Eliot , FR. Levis اور دوسرے کئی نقادوں نے اسے مستحکم کیا۔ بعد میں چل کر دوسرے بہت سے نقادوں اور دانش وروں نے ادبی تنقید کی خصوصیات یعنی اس کی معروضیت اور شفافیت کو سراہا۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ ادبی تنقید قبل مغرب یا مشرق میں رومانوی تحریک اور پھر تاثراتی اور جمالیاتی تنقید کا چلن تھا۔ انہیں نظریات کو بنیاد بنا کر فن پاروں کے حسن اور قبح کی جانچ پرکھ ہوتی تھی لیکن ادبی تنقید کے ذریعے فن پاروں کی تعین قدر پسند و ناپسند سے الگ خالص معروضی اور جانب دارانہ انداز نقد کو اپنایا گیا اور اس طرح اس کے دائرۂ فکر اور طریقۂ کار میں حد درجہ وسعت آئی۔

مغرب میں ادبی تنقید اور اس کے ارتقا کے متعلق مختلف اوقات میں مختلف دانش وروں نے اپنی آراء کا اظہار کیا ہے اس ضمن میں ایک پیراگراف ملاحظہ کریں:

"The truth is therefore , that the real progress the positive and lasting significance of these two Centuries in critical history , lies not in the dissolving of neo classicism but

ratner in the more enlightmint Conception of literary Criticism that was gradually former during that process, in itss suggestive thories, its varied judicial me thods and active Jidgements , elements which more effectively than is sometime supposed , prepared the way for the Critical achievement of the 19 th Century."1

ادبی تنقید بھی دوسری تنقیدات کی طرح فن پارے کے عیوب ومحاسن پر انطباق کرتی ہے۔لیکن ایک فرق یہ ہے کہ یہ تاثراتی تنقید کے برعکس فن پارے کا صحیح اور بے لاگ تجزیہ کرتی ہے اور اس کے قدر و قیمت یا مقام ومرتبہ کا تعین کرتی ہے۔ادبی تنقید دوسری تنقیدات سے الگ ہٹ کر فن پارے کی روح تک پہنچتی ہے اور اس کے تمام مخفی گوشوں کو اجاگر کرتی ہے۔شعر ہو یا تخلیقی نثر اس کی تمام پرتیں اور تہیں واضح کرتی ہے ۔اس طریقہ کار کے باوصف ادبی تنقید فن پارے کے سیاق سباق اور پس منظر و پیش منظر

---

1 English literary Criticism:17th and 18th Century.

Dr. Arkins. P.356

سب کو پیش کر کے ایک بالکل غیر جانبدارانہ ماحول خلق کرتی ہے جس سے ادب پارے کی پرکھ اور حسن و قبح کی حقیقی شبیہ ابھر کر سامنے آتی ہے۔ ادبی تنقید کا رجحان بھی ظاہر ہے مغرب سے اخذ کیا گیا ہے لیکن وقت کے بدلنے کے ساتھ رجحان و میلان میں بھی تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے نئی تنقیدی روش اور نئے طریقۂ کار سامنے آتے رہتے ہیں۔ اصول اور نظریے میں جزوی طور کچھ چیزیں رد ہوتی ہیں اور کچھ نئی چیزیں جڑتی ہیں۔

اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ادب اور تنقید بھی زمانے کے انقلابات، سائنسی ایجادات اور نئی ادبی تھیوریز سے متاثر ہوتے ہیں۔ یعنی جملہ علوم و فنون اور مختلف تنقیدی رجحانات زمانے سے بہت کچھ حاصل کرتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ اقتباس اہم ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:۔

> ''تمام علوم میں نظریات، تصورات اور اصطلاحات کے ضمن میں تبادلہ کا عمل جاری رہتا ہے۔ چنانچہ مارکسیت، عمرانیات، تاریخ، جمالیات، نفسیات وغیرہ سے جب تنقید نے اثرات اخذ کئے تو ان علوم سے مخصوص تصورات اپنی اصطلاحات بھی ساتھ لائے۔ کچھ کے مفاہیم درست سمجھے گئے تو کچھ متنازعہ ثابت ہوئیں لہٰذا نقاد کے لیے سب سے واقفیت ضروری ہوتی ہے۔ اگرچہ تنقید کی ہمیشہ سے تخلیقات کی پرکھ کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ تنقید کے وسیع تناظر کو محدود کر دینے اور عمل نقد کے وسیع اور پرتنوع کل میں سے محض ایک یا چند اجزا منتخب کر کے

محیط بے کراں کو ذرا سی آبجو میں مقید کر دینے کے مترادف ہے.....''[1]

درج بالا اقتباس کے ذریعے ڈاکٹر سلیم اختر نے تمام ادبی اور تنقیدی رجحانات سے واقفیت کو لازمی قرار دیا ہے کیونکہ تنقید محض فن پارے کے اچھے یا برے کی طرف اشارہ نہیں ہے بلکہ تنقید اپنے آپ میں بہت وسعت اور تنوع رکھتی ہے۔ اس کے دائرے میں وہ سب کچھ آجاتا ہے جو زندگی اور اس کے باریکیوں سے تعلق رکھتا ہے۔ مذکورہ اقتباس میں اس امر پر بھی زور دیا گیا ہے کہ فی زمانہ رویے اور رجحانات بدلتے ہیں۔تصورات اور اصطلاحات بدلتے ہیں اور تنقید خود کو update رکھنے کے لیے سب پر نظر رکھتی ہے۔اس طرح یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ فن پارے کے تجزیے اور تحلیل کے دوران ان تمام امور کو توجہ میں رکھنا اچھی تنقید کے لیے از حد ناگزیر ہے۔ نقاد اپنے نظریے، اپنے علم اور اپنی فکر کے اعتبار سے ہی اپنا طریقۂ کار وضع کرتا ہے۔اور یہی طریقۂ کار اس کی شناخت بن جاتا ہے۔

ادبی تنقید کی مغرب میں ایک لمبی روایت رہی ہے۔ ۱۷ویں اور ۱۸ویں صدی کے دوران کئی مغربی ناقدین نے ادبی تنقید کی تعریف و توضیح کی اور مختلف اوقات اور مرحلوں میں اس نوع کی تنقیدی کاوشوں کے ذریعے فن پاروں کے افہام و تفہیم کی کوشش کی گئی۔تاکہ وضاحت اور صراحت کے ساتھ بالکل معروضی اور غیر جانبدارانہ انداز میں تجزیہ و محاسبہ کیا جائے۔اس سلسلے میں درج ذیل اقتباس ملاحظہ کریں:۔

---

[1] تنقیدی دبستان۔ڈاکٹر سلیم اختر۔ص۔۱۵

" Literary criticism in the west , in its long career , from the time of plato to this day , has passed through several phases and stages, which are interconnected in various subtle and complex ways . A prefatory glance at these phases , therefore is essential for a clear and proper understanding and appreciation of the development of literary criticism in England from the early sixteenth century to the present age."[1]

ادبی تنقید میں تنقید نگار مغربی تھیوریز کی وضاحت تو کرتا ہی ہے ساتھ میں اردو کے لسانی اور ادبی پس منظر کو بھی پیش نظر رکھتا ہے اور پھر ایک ایسا طریقۂ کار اپناتا ہے جس سے ادب شناسی کی سبھی جہتیں واضح

1۔ Literary Criticism by Ramaawadh Dwidi Vikramaditya Raj Introduction-pg;1

ہو جاتی ہیں۔ حالانکہ اس ضمن میں پروفیسر محمد حسن کا اختلاف یہ ہے کہ:۔

''ادبی تنقید کا کوئی ایک دبستان ادب شناسی کی سبھی جہتوں سے انصاف نہیں کرسکتا۔ ضرورت اس کی ہے کہ ادب کی تفہیم کے سبھی پیمانوں اور سبھی طریقۂ کار کو مناسب حد تک کام میں لایا جائے''[1]

پروفیسر محمد حسن نے اس اقتباس کے ذریعے ادبی تنقید کے دائرے کو اور بھی وسعت دینے پر زور دیا ہے۔ بہر حال مختصر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ادبی تنقید ایک طرح سے سائنسی وضاحت کا رویہ رکھتی ہے اور ایسا طریقۂ کار اپناتی ہے۔ جو معروضی ہونے کے ساتھ مبنی بر انصاف ہو۔

☆

---

[1] شناسا چہرے۔ پروفیسر محمد حسن۔ صفحہ۔٦

تنقید کے مختلف دبستان

اردو میں تنقیدی رجحانات اور مختلف دبستانوں کی بابت اظہار خیال کرنے سے قبل ان بنیادوں کا ذکر لازمی ہوگا جن سے استفادہ کر کے اردو تنقید ارتقاء پذیر ہوئی۔

ادب میں تنقید کا آغاز چوتھی صدی (ق م) میں افلاتون اور اس کے شاگرد ارسطو کے نظریوں سے ہوا۔ Plato نے اپنی اہم ترین تصنیف جمہوریت (Republic) میں ادب اور آرٹ کو لایعنی شے قرار دیا اور شاعروں ادیبوں کو محض نقال گردانا۔ اس کے مطابق ادیب اپنے طور پر کچھ نہیں کرتا وہ صرف پہلے سے موجود اشیاء کی نقل پیش کرتا ہے اور یہ نقل حقیقت کو اور بھی بگاڑ دیتی ہے۔ Plato کے مطابق شاعری کی یہ غیر معمولی اثر آفرینی اس کی تصوراتی جمہوریہ کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ یہی سبب تھا کہ پلیٹو نے شاعروں کو اپنی ریاست سے باہر نکل جانے کا حکم صادر کر دیا۔ لیکن آگے چل کر افلاطون کے لائق شاگرد اور معروف مفکر ارسطو نے اپنے استاد کے نظریے سے اختلاف کیا اور شاعری کے (طربیہ والمیہ) کی باریکیوں سے مدلل بحث کی۔ اس نے اپنی تصنیف بوطیقا (Poetics) میں شاعری کے اوصاف کی وکالت کرتے ہوئے ثابت کیا کہ نہ شاعر نقصان دہ ہے اور نہ شاعری۔ بلکہ یہ جبلت عین فطرت ہے اور

انسان اس کے ذریعے فطرت کی عکاسی کرتا ہے۔ افلاطون کے اس نظریہ سے اختلاف کیا کہ یہ محض نقالی ہے۔ اس ضمن میں اس نے یہ توضیح پیش کی کہ نقالی میں بھی ہنرمندی کی لازمیت منعکس ہوتی ہے اور پہلے سے موجود اشیاء کی جب فنکار تصویر کشی کرتا ہے تو اس میں ایسی کشش پیدا ہو جاتی ہے جو انسانی ذہن و دل کو اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہے۔ اس نے المیہ کو طربیہ پر فوقیت دیتے ہوئے کہا کہ المیہ کے ذریعہ انسان اپنے نفس کی تطہیر بھی کرتا ہے اس لیے اس کے افادی پہلو سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا ہے۔

رومی نقاد ہوریسؔ نے ارسطو کے نظریے سے اتفاق کرتے ہوئے اپنی کتاب Art of poetry کی تصنیف کی۔ اس منظوم تصنیف کو کلاسیکی تنقید کے لیے متحرک تصور کیا جاتا ہے۔ ہوریسؔ نے ارسطوؔ کے نظریات سے استفادہ کرتے ہوئے فن شاعری کے اہم اصول میں سلیقہ مندی اور باضابطگی (Decorum) کو ناگریز بتایا۔ اس کے مطابق ادب میں باضابطگی، موزونیت اور نفاست کا سلیقہ از حد ضروری ہے ساتھ ہی معتدل اور متوازن رویہ بھی ہونا چاہئے۔ وہ ادب و شاعری میں لفظوں کے استعمال پر زور دیتا ہے ساتھ ہی مختلف علوم سے واقفیت بھی ضروری قرار دیتا ہے۔ ہوریسؔ نے گرچہ ارسطوؔ کے نظریے کی پیروی کر کے جدت طبع کا ثبوت پیش کیا ہے لیکن وہ متقدمین کے شعری سرمایے کو معیاری اور مثالی ثابت کرتا ہے اور نئے لکھنے والوں کے لیے اس کا تتبع ضروری سمجھتا ہے

اردو میں تنقید کی درجہ بندی سے قبل افلاطون، ارسطوؔ اور ہوریسؔ کے نظریات جزوی طور پر ہی سہی ادب پر منطبق ہو رہے ہیں۔ آگے چل کر کلاسیکیت (Classicism) نے بھی ادب بالخصوص تنقید کے

لیے کچھ ضابطے وضع کیے۔کلاسیکیت کے نظریہ سازوں نے الفاظ کے تفحص، بلاغت اور غیر معیاری نقطوں کی نشاندہی کی۔صرف ونحو اور زبان کی شستگی اور شائستگی پر زور دیا۔اس نظریے کی رو سے ادب پر کچھ پابندیاں لگائی گئیں تاکہ ادب میں اصول، اعتدال اور عقلیت کا وصف آجائے۔ ان پابندیوں کو سید عبداللہ نے اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے:

''(۱) انفرادیت کی بجائے قواعد واصول کی پیروی۔اسلوب کے حسن اور زبان کے مروجہ اور مسلمہ قواعد پر اصرار۔

(۲) زندگی کی مادی ضرورتوں اور مسائل کا تذکرہ۔

(۳) معنی پر بیان کو ترجیح۔

(۴) مقصد پر اصرار۔

(۵) علمی وعقلی اصولوں اور قاعدوں کی پیروی۔''[۱]

محولہ اقتباس کی روشنی میں یہ واضح ہوتا ہے کہ کلاسیت کے پیروکاروں کے مطابق قواعد اور ضوابط کو اولیت ملنی چاہئے۔اور اس ضابطے کو زبان وبیان کے استعمال کے وقت بھی نظر میں رکھنا چاہئے تاکہ باتیں جو ادبی پیرائے میں پیش ہوئی وہ سچائی پر مبنی ہوں اور ان کے اندر تصنع کی بجائے فطریت اور شفافیت کا وصف ہو۔کلاسیکی تنقید میں بھی ترقی پسند تحریک کی طرح ادب کے کارآمد اور مفید ہونے پر زور نظر آتا ہے۔

---

[۱] اشارات تنقید۔سید عبداللہ۔جمال پریس دہلی صفحہ۔۴۵۹

کلاسیکی نقادوں کے مطابق اگر صداقت اور سچائی کی جگہ تخئیل اور تصور کی کارفرمائی غالب ہو تو کچھ حد تک قابل برداشت ہے لیکن زبان کی ناشائستگی اور پھوہڑ پن کسی طور بھی قابل قبول نہیں ہے۔ ایک نکتہ اہم یہ بھی ہے کہ ادب پارہ مروجہ سماجی اقدار پر ضرب نہ لگائے بلکہ سماجی آداب ورسوم کا احترام کرے اور کہیں طنز اور استہزا کا پہلو ہو بھی تو سخت اور درشت نہ ہو۔ ساتھ میں فن پارہ کو Form کا التزام ہر حال میں کرنا چاہئے۔ کلاسکی نقادوں کے ذریعے وضع کئے گئے ان اصولوں کو سب سے پہلے فرانس میں اپنایا گیا۔ فرانسیسی تنقید نگار بوّلو (Brileau) اس سلسلے کا سب سے بڑا اور اہم نام تھا۔ اس نے اپنی کتاب L'Artpoetique میں کلاسکی اصولوں کو نئے سرے سے مرتب کیا۔ اس کلاسکی تحریک نے بوّلو کی کوششوں سے نئی شکل اختیار کی اور یہ نو کلاسیکیت کے نام سے موسوم ہوئی۔ بوّلو کے نظریات سے اس کے عہد اور اس کے متعدد شعراء ادباء متاثر ہوئے۔ مثال کے طور پر John Dryden کا مضمون An Essay of Dramatic Poesie'' الگزنڈر پوپ کا مضمون Essay on criticism اور Samuel Johnson کی تصنیف Lives of Poets نو کلاسکی تنقید کے نمونے کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں۔

اردو تنقید میں دبستانی تقسیم کا آغاز بہت بعد میں ہوا۔ مغرب کے زیر اثر اردو میں تنقیدی افکار اور نظریات نظر تو آتے ہیں لیکن مغرب کی طرح باضابطہ تنقید کی درجہ بندی نظر نہیں آتی۔ متعدد نقاد ایسے بھی مل جاتے ہیں جن کے یہاں ایک ساتھ کئی تنقیدی دبستانوں کی جھلک نظر آتی ہے۔ اردو میں تنقید کا باضابطہ

اور اصولی طور پر آغاز الطاف حسین حالؔی کے مقدمہ شعر وشاعری سے ہوتا ہے اس مقدمے میں مولانا حالؔی نے مغرب سے براہ راست استفادہ کیا ہے اور افلاطون اور ارسطو، دونوں کے افکار اور خیالات موقع بہ موقع استعمال کیا ہے، اور ان سے اتفاق بھی کیا ہے۔ حالؔی شعر کی تعریف تو کرتے ہیں لیکن مدح کی جگہ مذمت کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ حالؔی کے مقدمے کا آغاز شعر کی مدح و ذم'' سے ہوتا ہے۔ جس میں انہوں نے افلاطون کے خیالات سے اپنی واقفیت کو ظاہر کی ہے ان کے مطابق:

''شعر کی مدح و ذم میں ابہت کچھ کہا گیا ہے اور جسقدر اس کی مذمت کی گئی ہے وہ بہ نسبت مدح کے زیادہ قرین قیاس ہے..... افلاطون نے جو یونان کے لئے جمہوری سلطنت کا خیالی ڈھانچہ بنایا تھا اس میں شاعر کے سوا ہر پیشہ اور ہر فن کے لوگوں کی ضرورت تسلیم کی تھی۔''[1]

اسی طرح وہ دوسری مثال دیتے ہوئے۔ میکالؔے کا حوالہ (نام دیئے بغیر) دیتے ہیں اور اس کے شعر کے متعلق خیالات کو من وعن تسلیم کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''زمانہ حال میں بعضوں نے شعر کو میجک لیٹرن سے تشبیہہ دی ہے یعنی میجکسلینٹرن جسقدر زیادہ تاریک کمرے میں روشن کی جاتی ہے اسی قدر زیادہ جلوے دکھاتی ہے۔ اسی طرح شعر جس قدر جہل و تاریکی کے زمانہ

---

[1] مقدمہ شعر وشاعری۔ الطاف حسین حالؔی۔ اسرار کریمی پریس۔ الہ آباد، صفحہ۔ ۲۰۔۵

میں ظہور کرتا ہے اسی قدر زیادہ رونق پاتا ہے۔"[1]

حالی کا یہ نظریہ صاف طور پر میکالے کے نظریے سے مماثلت رکھتا ہے۔ میکالے کے مطابق جہالت اور تاریکی میں ڈوبے معاشرے میں شاعرانہ خصوصیات زیادہ اثر انداز ہوتی ہیں ۔ پیش ہے یہاں میکالے کا وہ اقتباس جس سے حالی نے نہ صرف استفادہ کیا ہے بلکہ اس کے نظریے سے اتفاق بھی کیا ہے:۔

Whe think that as civilization advances poetry almost necessarily declines . Therefore though we fervently admire those great works of imagination which have appeared in dark ages , we donot admire than more because they have appeared in dark ages. [2]

---

[1] مقدمہ شعروشاعری۔ الطاف حسین حالی۔ اسرار کریمی پریس الہ آباد صفحہ ۲۔۵

[2] Macaulaujs Essays on Milton. pg. 10, Edited by Harinath Dacca- 1902

الطاف حسین حالی کے علاوہ دوسرے نقادوں نے بھی میکالے اور دسرے مغربی مفکرین و ناقدین سے استفادہ کرتے ہوئے اردو کی بالخصوص شعری اصناف کے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔شبلی کے یہاں شعرالعجم جلد چہارم میں شعر کی انگیزی اور ارسطو کے نظریات کی تائید بہ آسانی دیکھ سکتے ہیں۔ یہ کلاسیکی تنقید کی ایک طرح سے ابتدا تھی

رومانی تنقید:

رومانی تنقید کلاسیکی تنقید کی رد ہے۔ اٹھارہویں صدی کے آغاز میں برطانیہ کی شاعری فرانسیسی کلاسیکی ادب سے حد درجہ مشابہ تھی۔ چونکہ فرانس کا قدیم اور کلاسیکی ادب تصنع اور بیجا پابندیوں کے سبب اپنا اثر کھو چکا تھا۔اور تصوراتی رفعت اور فکریاتی گہرائی عنقا ہو رہی تھی۔ایسے موقع پر رومانی تنقید نے آگے بڑھ کر اس بے رس اور بے لطف ماحول کو تبدیل کیا۔اس تنقید کے اثرات بڑے پیمانے پر مرتب ہوئے۔ ۱۹ویں صدی کے اوائل سے قبل ہی رومانی تنقید جرمنی اور انگلینڈ میں مقبول ہو چکی تھی۔ جرمنی میں شلیگل کے ریویو داس اتھنیم (Das Athenaeum) کو ایک اہم تنقیدی کارنامہ تسلیم کرلیا گیا تھا۔ برطانیہ میں کالرج اور ورڈسورتھ کی مشترکہ تصنیف (Lyrical Ballads) نے اس نظریہ تنقید کو اور بھی مستحکم کر دیا۔۱۸۰۰ء میں ورڈسورتھ اپنا معروف دیباچہ Preface to the lyrical Ballads شامل کیا۔فرانس میں اس تنقید کی ابتدا مادام ڈی اسٹیل کی کتاب 'Del' Allemagne سے ہوئی۔اس کتاب کا ایک مثبت اثر یہ ہوا کہ اٹلی میں بھی اسے قبول کیا گیا۔رومانی تنقید پر مباحثہ قائم ہوا۔اس طرز تنقید

سے حالانکہ اختلاف بھی کیا گیا لیکن اس کے اوصاف کے باوصف اسے رفتہ رفتہ پورے یورپ میں اپنایا گیا۔ یہ رومانی ادب کے ہی اوصاف تھے کہ ادب میں بین الملکی سطح پر پرانے اور فرسودہ نظریات و خیالات سے انحراف برتا گیا اور واضح طور پر نیچر سے قربت کو لازمی قرار دیا گیا۔ Back to nature جیسا نعرہ ہی تھا کہ جذبات واحساسات اور سادگی و پرکاری سے رغبت بڑھی۔ رومانی نقادوں نے پہلے سے موجود اصول ونظریہ سے خود کو بری کرلیا اور بعض اوقات اس طرح کیا کہ انتہا پسندی در آئی۔ ان کے یہاں مسلمہ اصول اور عقلی دلائل کی جگہ اپنے جذبات اور محسوسات کو اہمیت دی گئی۔ اس طرح کلاسیکی اور رومانی دونوں طرز تنقید میں واضح فرق سامنے آ گیا۔

معروف مغربی نقاد رینے ویلک نے رومانی تنقید کی دو اہم خوبیوں کی نشاندہی کی ہے۔ یعنی نوکلاسیکیت کے خلاف بغاوت اور شاعری میں جذبات و اظہار و ترسیل و ابلاغ کے نظریے کی حمایت۔ ملاحظہ فرمائیں:

"One can speak ofa romantic movement in criticism in two many differnt senses; in a wider sense it was a revolt against neo. classicism, which ment a rejection of the latin tradition and the adoption of a view of

poetry centred on the expression and

communication of emotion."1

محولہ بالا اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مروجہ اصول وضوابط سے انحراف اور اپنے جذبات ووجدان کو اہمیت دینے کا جو رویہ رومان پسندوں نے عام کیا وہی رومانی تنقید کی اساس ٹھہری۔ ورڈسورتھ اور کولرج کا ذکر گزشتہ سطور میں ہو چکا ہے۔ ان فن کاروں نے اپنی تصنف Lyrical Ballads کو ایک طرح سے رومانی تنقید کا منشور بنا دیا۔ ان کے خیالات نے نہ صرف شاعری کو متاثر کیا بلکہ بعض ایسی تجویزات اور نظریات بھی پیش کئے گئے جو آگے چل کر بڑے پیمانے پر مقبول ہوئے۔ اور صرف مغربی ادب نہیں بلکہ دنیا کے دوسرے ادبیات نے بھی ان نظریات وخیالات سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی نظم ونثر کو تغیر وتبدل کی راہ سے گزارا۔

رومانی تنقید کے بنیادی نکات اور واضح اثرات کے متعلق رام اودھ دویدی اور وکرمہ ادتیہ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے:

"Freedom in the keynote of romantic

critcism which exhibits originality in Janathan

cape London,1970 coneeption andapproach

1۔ Renewellek, A history of modern criticism Vol. II Pg.e,

for enturies it hed become customary to define poetry as imitation or as invention. After the fashion of Aristotle or Horace. The neo Classicism had considerably, narrowed down the meaning of these ancient terms and consequintly their view of literature had become steriotyped. Those who sponsored Romantic criticism attempted now defination of poetry conceived in the sprit of freedom which non pemeated all spheres of human existence. Emotion and imagination were enfracnchised and acquired new authority in the domain of Art"1

---

1 literary criticism by Ramaawadh & Vikramaditya Pg. 243

Literary Criticism کے مذکورہ مصنفین نے درج بالا اقتباس میں جہاں رومانی تنقید کے بعض اہم نکات اور نظریات پر اظہار خیال کیا ہے وہیں انہوں نے اسے مغرب میں عہد وکٹوریہ سے بھی متاثر ثابت کیا ہے۔ اور اس عہد کی رومانی تنقید کو Victorian Criticism کا نام دیا ہے۔ اس نوع کی تنقید رومانی تنقید سے الگ نہیں تھی لیکن عہد وکٹوریہ کے واضح اثرات اس وقت کی نظم ونثر پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس ضمن میں اظہار خیال کرتے ہوئے مذکورہ بالا تصنیف کے مصنفین نے لکھا ہے کہ:

"Visualised as a whole victorian criticism appears as a mosaic of diverse views. The homogeniety of the preceeding period has yielded place to great complexity. Different tendenceis and groups are seenat work semultaneously .There were the votarees of science and material progress opposed by idealists and prophets..... Queen Victoria its characteristic tone was the part played by the period ideals. The periodicals which

become important even during the age of Romantic Revival gained more influences in the period under survey. It is different to think of any important critic of the period who was not attached to one or other of these Journals....."[1]

درج بالا سطور میں رومانی تنقید کے آغاز وارتقاء کے اسباب وعلل پر گفتگو کے بعد یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ کلاسیکی طرز تنقید کے انحراف میں شروع ہوئی۔ اس طرز تنقید نے اپنے نظریات کے سبب نہ صرف انگریزی بلکہ دوسری زبانوں کے طریقہ تنقید کو بھی نئی راہ دکھائی۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ رومانی تنقید کے ذریعے آزادی کی فضا ہموار ہوئی۔

جہاں تک اردو میں اس کے آغاز وارتقاء کا سوال ہے تو یہ وضاحت یہاں ضروری ہے کہ اردو کا ماحول اور پس منظر مغرب سے بالکل جدا تھا۔ یہاں نہ انقلاب فرانس کا پس منظر تھا اور نہ کلاسیکی ادب کے خلاف کوئی باضابطہ تحریک تھی۔ اردو میں مغرب کے رومانی نظریے کی ہو بہو میں نقالی نظر نہیں آتی اور نہ ہی

---

[1] Literary criticism by Ramaawadh Dwidi and Vikramaditya Pg. 243

وہ خال وخط نظر آتے ہیں جو اس باضابطہ نظریے کو پیش کرتے ہیں۔ اردو میں قومی تحریکوں، سماجی اور اصلاحی کش مکش، مقامی و بیرونی اثرات اور ادب میں بدلتے نظریے کو اس کے تناظر کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔ اس ضمن میں احتشام حسین کا اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''بیسویں صدی کے آتے آتے آزادی کی خواہش اور مغربی اثرات نے عمل کی دنیا سے دور ایک انتہا پسندانہ رومانوی اور تخیلی انداز نظر بھی پیدا کر دیا تھا جو کسی کے یہاں مذہب سے بغاوت کی شکل میں کسی کے یہاں تخیلی رنگین بیانی اور والہانہ گمشدگی کے رنگ میں رونما تھی جو زنجیریں واقعی زندگی میں نہیں ٹوٹ سکتی تھیں وہ خیالوں میں ٹوٹتی گئیں اور تصور کی مینا کاریوں سے محدود زندگی ہی میں نئے چمن کھلنے لگے۔''[1]

محولہ اقتباس کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ رومانی تنقید بعض معنوں میں کلاسیکی ادب کی فرسودہ خیالی اور سختی کے ردعمل میں شروع ہوئی۔ خاص طور سے اردو میں جو فارسی کے اصول و معیار غالب تھے ان سے اکثر اختلاف کی صورت نظر آتی ہے۔ دبستان لکھنؤ کے متعینہ اصول بالخصوص ناسخ کے متعین کردہ اصول زبان جو ایک معیار وضع کیا تھا اس سے ادبی اظہار میں رکاوٹ آ رہی تھی۔ محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی نے اس اصول کی نفی کی۔ آگے چل کر اس نظریے کی پرورش و پرداخت میں علی گڑھ نے اہم کردار ادا

---

[1] علی گڑھ میگزین (علی گڑھ نمبر) احتشام حسین۔ ۵۴۔۱۹۵۵۔ ص۔ ۱۴۴

کیا۔مہدی افادی،سجاد حیدر یلدرم اور عبدالرحمٰن بجنوری جیسے ادیبوں نے روایتی مادیت عقلیت اور مقصدیت کو رد کرتے ہوئے رومانی جذباتیت تصوریت، وجدان اور حسن کی پیش کش کو رواج دیا۔ ورڈسورتھ، کیٹس اور شیلے جیسے خالص رومانی شعرا سے اثرات اخذ کئے گئے۔اردو کے اکثر رومانی نقادوں نے ادب میں زیادہ عمق اور معنی آفرینی کے بدلے اپنے اندرون یعنی اپنے جذبات اور احساسات کو اولیت دی۔اس سلسلے میں عبدالرحمٰن بجنوری کا نام سرفہرست ہے۔عبدالرحمٰن بجنوری نے، رومانی تنقید کا بہترین نمونہ پیش کیا۔ان کی شہرت ان کی تصنیف ''محاسن کلام غالب'' کے ذریعے تھی۔انہوں نے غالب کے کلام کی رومانی تنقید کے ذریعے کئی نئے گوشے اجاگر کئے۔رومانی نقادوں کے مطابق جذبات کی شدت عقل کی منطق سے زیادہ اہم ہے۔تنقید کو مادی اسباب کے ذریعے فیصلے صادر نہیں کرنا چاہئے بلکہ وجدان اور جذبے کو اپنا راہنما بنانا چاہئے۔بجنوری کے یہاں جذبات کی اسی سرمستی کو اولیت دی گئی ہے۔اور ان کے مطابق یہی شے غالب کو غالب کرتی ہے۔غالب کی شاعری کا مطالعہ پیش کرتے ہوئے عبدالرحمٰن بجنوری ان کے یہاں موجود شاعرانہ کوائف کی توضیح اپنے مخصوص نظریے یعنی رومانی نقطہ نظر سے کرتے ہوئے اظہار خیال کرتے ہیں۔ملاحظہ کریں:

> ''شاعرانہ جذبہ اور وجدان میں ایک ایسی کیفیت بھی واقع ہوتی ہے جس کو سرمستی سے مترادف کیا جاسکتا ہے۔جس میں شاعر آفتاب و ماہتاب کو اپنے کف دست میں اٹھالیتا ہے۔اس بے خودی کے عالم میں مرزا نے کلام موزوں کیا ہے۔''[1]

---

[1] محاسن کلام غالب۔عبدالرحمٰن بجنوری۔ص۔۳۶

مرزا کے کلام کو اپنے خاص نظریے کی مدد سے پیش کرتے ہوئے بجنوری نے اکثر مقامات پر ایسے جملے تحریر کئے جو خالص رومانی کہے جاتے ہیں۔ان میں معروضیت اور منطقیت کی تلاش بے سود ہے۔

مثال کے طور پر کلام غالب سے متعلق یہ جملے ملاحظہ کریں:

''ان کو حسن بے پایاں کے دیکھنے سے اک ارتعاش روحانی، ایک وجد و آگہی پیدا ہوتا ہے۔جس میں جذبات کامراں اور خواہش کام جوئی کا کوئی عنصر نہیں۔''[1]

'' ہندستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ مقدس وید اور دیوان غالب۔''[1]

درج بالا جملوں کی روشنی میں کہہ سکتے ہیں کہ اردو میں رومانی تنقید کی سب سے بڑی مثال عبدالرحمٰن بجنوری ہیں۔ ان کے بعد آنے والوں میں مجنوں گورکھپوری کا نام بھی اہم ہے۔ بطور مثال ان کی تصنیف ''پردیسی کے خطوط'' کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ

''مجنوں کی شاعری اور افسانہ نگاری کا انداز رومانی ہے۔اس رومانی رجحان کا اثر ان کے تنقیدی مضامین پر پڑنا فطری تھا۔مغرب کی رومانی تحریک کا انہوں نے بغور مطالعہ کیا تھا اور اس موضوع پر انہوں نے پردیسی

---

[1] پردیسی کے خطوط۔مجنوں گورکھپوری۔ص۔۵۱۴

کے خطوط میں گہری بحث بھی کی ہے۔ کلاسیکیت ورومانیت کے تضاد کی

وضاحت کے علاوہ انہوں نے رومانی تحریک کے علمبرداروں کا بھی ذکر کیا ہے۔''[1]

رومانی نقادوں میں بجنوری ہوں یا مجنوں وغیرہ ان کے یہاں یہ صحیح ہے کہ ایک نئے اور آزاد روش کو عام کیا لیکن اس طرح طرز تنقید نے کچھ صالح، سنجیدہ اور تعمیری پہلوؤں کو نظر انداز کیا۔ عقل، منطق اور معروضیت کی نفی کرتے ہوئے جذبات واحساسات، مسرت، حسن اور تخیل پر زور دیا۔ اس وجہ سے اس کی اہمیت محدود ہوگئی۔

سائنٹفک تنقید:

تنقید کی مختلف دبستانوں میں سائنٹفک تنقید (Scientific Criticism) بھی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس طرز تنقید میں معیار پرستی کو نشانہ بنایا گیا۔ اس میں تعین قدر اور نتائج کے بدلے تجزیے کو بروئے کار لانے پر زور دیا گیا۔ اور تنقید کے لئے نئی اصول بندی لازمی قرار دیا گیا ہے۔ واضح ہو کہ باضابطہ سائنٹفک تنقید کی اصطلاح سے قبل مارکسی اور تاریخی تنقید کو بھی سائنٹفک تنقید کہا جاتا رہا ہے۔ جبکہ حقیقی صورت حال یہ ہے کہ سائنٹفک تنقید ایک دبستان سے زیادہ ایک ایسا مخصوص طرز ہے جس میں غیر جانبداری کے ساتھ فن پارے کا تجزیہ کر کے اس کے مقام ومرتبے کا تعین کیا جائے۔ اس تنقید میں نقاد نہ کسی ادیب سے متاثر ہوتا ہے اور نہ ہی اپنی ذاتی پسند اور ناپسند کو اولیت دیتا ہے۔ وہ معروضی انداز اپنایا

---

[1] محاسن کلام غالب۔ عبدالرحمٰن بجنوری۔ ۳۶

ہے۔ اور بالکل ایک سائنس داں کی طرح دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرتا ہے۔ تا کہ وضاحت اور صراحت کے ساتھ ادب پاروں کا مطالعہ ممکن ہو سکے۔

سائنٹفک تنقید سے قبل تجزیاتی تنقید کی مثالیں تنقید میں جا بجا مل جاتی ہیں۔ تجزیاتی تنقید کو اگر اس کے مخصوص معنی سے علاحدہ کر کے دیکھیں تو پھر تنقید کے ہر اس طریقہ کو ہم تجزیاتی قرار دے سکتے ہیں جس میں کسی تخلیق کا معروضی اور Detached مطالعہ کیا جائے۔ اس طرز تنقید کا اہم پیش رو William Empson تھا۔ وہ اپنے استاد آئی اے رچرڈز کے اتباع میں اپنی تنقید کو الفاظ میں معانی کی مختلف صورتوں سے ظاہر ہونے والے ابلاغی تنوع اور اس کے مضمرات کو آئینہ کرتا ہے۔ اور اسے ہی فن کا اصل مقصد ثابت کرتا ہے۔ اس سلسلے میں اس کی دو کتابیں:

1. Seven Types of Ambiguity. 1930

2. Some versions of pastoral . 1930

یورپ اور امریکہ میں کافی معروف ہو چکی ہیں۔ Empson کے مطابق شاعری میں جذبات و احساسات کے برعکس زبان کو اہمیت دیتا ہے۔ اور کسی فن پارے کی اہمیت اور عظمت کو زبان کے معیار پر پرکھتا ہے۔ الفاظ کے رموز و اسرار سے خصوصی شغف تجزیاتی تنقید کو مشرقی روایت سے جوڑتی ہے جہاں علم بیان اور صرف و نحو پر حد درجہ زور نظر آتا ہے۔

تجزیاتی تنقید کے بعد استقرائی تنقید کا نظریہ سامنے آتا ہے۔ اس طرز تنقید کے پیروکاروں کے

مطابق سائنسی علوم میں اصول وضوابط کو عملی صورت نہیں دی جاسکتی۔ مشاہدات و تجربات سے ان کے Inducion کے بعد آگے کے مرحلے کیلئے ان سے مدد لے جاسکتی ہے۔ استقرائی تنقید نگاروں کے خیال میں تنقید کو پہلے سے موجود اصول وضوابط یا دوسری ہدایتوں سے الگ ایک سائنس داں کی ہی طرح کسی فن پارے کا مطالعہ کرنا ہے۔

اس ضمن میں ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''تنقید ایک فن ہے جو ادب کو سائنس کے دائرہ میں لاتا ہے۔ ادب دائمی چیز ہے اور ہر دور میں ایک الگ سائنس کے اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔ اور فن تنقید اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اٹھارہویں صدی میں منطق بہت اہم سائنس تھی۔ لہٰذا منطقی اصولوں پر چلتی دکھائی دیتی ہے۔ انیسویں صدی میں مابعد الطبعیات زیادہ اہم ہوگئے اور انیسویں صدی کی تمام تنقید مابعد الطبعیات اور الہام پر مبنی ہے۔ اب سے اہم سائنس ہوئی اور تنقید بھا سائنسی تجربات اور Induction سے مدد لینے لگی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تنقید بالکل سائنس ہو جائے۔''[1]

محولہ اقتباس کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ استقرائی تنقید ادب پارہ کے حسن وقبح سے کوئی

---

[1] تنقید وتنقید نگاری۔ مطبوعہ۔ ''نئی نسلیں''۔ کراچی۔ اکتوبر ۱۹۷۸ء

خاص مطلب نہیں رکھتا۔ اس طرز تنقید میں ادب کا سائنسی تحقیقات کی طرح جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس تنقید میں ادبی ضابطے کو فن پاروں میں تلاش کیا جاتا ہے۔ اور ادب کو بھی فطرت کے مظاہر کی طرح ارتقائی عمل سے گزارنے کی کوشش ہوتی ہے۔ یہ تنقیدی روش ادب کے مختلف دبستانوں اور صنفوں کو کئی درجوں میں بانٹ دیتی ہے۔ اور ہر درجہ کے علاحدہ مطالعہ کیلئے خاص رجحان ہی نہیں بلکہ خارجی عوامل بھی بے معنی ثابت ہوتے ہیں۔

اس طرز تنقید کے متعلق مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ابتدا سے ہی نزاعی صورت حال کی شکار ہے۔ اس تنقید نے اپنے انکار یہ رویے کے سبب ان تمام دبستانوں اور رجحانات کو مشکوک نظروں سے دیکھا جس میں سائنسی قطعیت اور غیر جانبداری کا دعوی کیا جاتا ہے۔ آگے چل کر اس کی حد درجہ مخالفت ہوئی اور آخر میں تو ٹی ایس ایلیٹ نے یہاں تک کہہ دیا کہ

''تنقید نہ تو سائنس ہے اور نہ ہی وہ سائنس بن سکتی ہے۔''[2]

جمالیاتی تنقید: (Aesthetical Criticism)

معروف یونانی مفکر افلاطون نے پہلی دفعہ باضابطہ طور پر اپنی تصنیف 'جمہوریہ' اور Phaedrus میں جمالیات کی تعریف اور ہیئت کو متعین کیا۔ اور اس کے اصول وضوابط کو ترتیب دیا۔ حالانکہ افلاطون عینیت پسند تھا۔ اس کے مطابق دنیا اور اس میں موجود تمام چیزیں اور مظاہر خام ہیں۔ اور یہ تمام اور حقیقی

---

2. Frontiers of Criticism. T.S. Eliot

اور ماوراقوت کے عکس میں جوہر طرح سے مکمل ہے۔افلاطون کا تصور تھا کہ دنیا میں انسان کو قدرت کے شاہکار کا اصل اندازہ نہیں ہوسکتا کیونکہ جو کچھ نظر کے سامنے ہے وہ امیٹیشن ہے۔اس لئے کہ قدرت کا جلوہ مستور اور مخفی ہے۔آگے چل کر اس فلسفے کو فلاطیونس نے اور بھی پیچیدہ بنا دیا۔مذکورہ بالا مفکر سل کے خیالات سے علاحدہ دوسرے یونانی فلسفیوں اور بالخصوص Stoies نے کہا کہ خیر حسن ہے۔اس کے نزدیک ہر شے جو حسین وجمیل ہے وہ خیر پر مبنی یا خیر کا عکس ہوگی۔یعنی حسن کبھی بھی شر اور برائی کا موجب نہیں ہوسکتا کیونکہ حسن اتنا صاف شفاف اور پاکیزہ ہے کہ گندگی اور ناپاکی اسے چھو بھی نہیں سکتی۔کم وبیش یہی تصور معروف المیہ نگار سوفوکلیز کے یہاں بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔جس کا اظہار اس کے یہاں جابجا ملتا ہے۔

جمالیات ایک نہایت ہی عمیق اور فکر انگیز اصطلاح ہے،جس کا تعلق حسن وقبح اور فنکارانہ نفاستوں سے ہے۔اسے اکثر ناقدین ومفکرین نے فلسفہ جمال اور فلسفہ فنون بھی کہا ہے۔جمالیات کی پشت پر ایک وسیع پس منظر ہے اور اس کے دائرے میں کسی شے اور مظاہر کے حسن و جمال کے علاوہ فن کاری،تنقید، نفسیات اور یہاں تک کہ عمرانیات بھی سمٹ آتے ہیں۔فنون لطیفہ کی تمام صورتیں یعنی ادب، رقص، تعمیرات، نقاشی، سنگ تراشی، مصوری تصویر کشی اور فلم سازی وغیرہ بھی اس فلسفے کے حدود میں شامل ہیں۔..... یہ تحریک افلاطون اور فلاطیونس جیسا کہ گزشتہ سطور میں عرض کیا گیا، ان کے بعد باضابطہ طور پر انیسویں صدی کے اواخر میں اپنے عروج پر تھی۔انگریزی ادب میں یہ رجحان کیٹس کے ذریعے مقبولیت کی

حدوں کو چھورر ہا تھا۔ اور کیٹس کا فلسفہ جمال یعنی:

"A thing of beauty is a joy for ever"1.

ایک طرح سے ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اس طرح کیٹس کا دوسرا جملہ:

''حسن صداقت ہے اور صداقت حسن ہے'' بھی اپنی مقبولیت کی حد تک پہنچ چکا تھا۔

اٹھارویں صدی کے فرانس میں جمالیاتی تحریک کے علمبرداروں نے اس نظریے کو عام کیا۔ ان کے نظریے کے مطابق کسی بھی تخلیق اور فن پارے کا تعلق افادیت سے یا اخلاقی اقدار وغیرہ سے نہیں ہے۔ فن کا براہ راست اور اصل تعلق حسن اور مسرت سے ہوتا ہے۔ اس فکر کو آگے چل کر جلا بخشنے والوں میں آسکر وائلڈ، والٹر پیٹر، سوئن برن اور لائنل جانسن بھی شامل ہو گئے۔ ان جمالیاتی مفکرین کے مطابق فن کو صرف اپنی Perfection سے غرض ہوتی ہے۔ یہ حسن کی تلاش اور جستجو ہے۔ تحریک جمالیات نے جمالیاتی قدروں سے یہ مراد لیا کہ وہ خاص اصول جمالیات میں جو فنی و ادبی تخلیق میں موجود حسن کے اجزاء کے مقام و مرتبے کا تعین کرنے میں معاون ہوتے ہیں اس طرح جمالیاتی کا ادب اور ادبی تنقید سے گہرا تعلق استوار ہو جاتا ہے۔ ادب کو فنون لطیفہ میں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل قرار دیا گیا ہے اور ادب کے افہام و تفہیم کیلئے جمالیات کا شعور لازمی ہے۔ یعنی ادب کو خوشنما اور مسرت افزا بنانے میں ان عناصر کی تلاش جمالیاتی تنقید کا خاص منشا ہے جن کے بغیر ادب ادب ہو ہی نہیں سکتا۔ آئی۔ اے رچرڈز کے مطابق

---

1. The first line of the Vol. of work Endymion. 1818. Keats

جمالیاتی طرز تنقید، تنقید کا ایک ایسا پیرایہ ہے جس کے استعمال سے چیزوں کا ادراک کیا جاتا ہے۔ اس پیرائے سے مثبت نتائج بھی برآمد ہو سکتے ہیں اور بے معنی بھی۔ دیکھیں اقتباس:

"The aesthetic mode is generaly supposed to be a peculiar way of regarding things which can be exercised, whelher the resulting exeriences are valuable disvaluable or indifferent. It is intended to cover the experience of ugliness as wel as that of beauty and also intermediate experiences." 1

سائنٹفک تنقید کے برعکس جمالیاتی تنقید معروضی انداز سے نہیں فنی انداز سے ادب کی افہام و تفہیم کرتی ہے۔ جمالیاتی تنقید کو عام طور سے حسن و جمال کی جستجو سے تعبیر کیا جاتا ہے جبکہ اس تنقید کے ذریعے بھی زندگی کے کڑے اور حقیقی مسائل کی عکاسی ہوتی ہے۔ لیکن اس کا خاص زور ادب میں کشش اور مسرت پر ہوتا ہے۔ اس طرز تنقید میں فنی تقاضوں کے التزام پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ یعنی شاعری میں ہر اس

---

1 I.A. Richard, Principles of criticism P. 10,London, 1970

نکتے کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ جس سے شاعری پر کشش، موثر اور نغمہ سنج ہو، یعنی ایک طرح سے جمالیاتی نقاد بھی ہیئت (Form) پر حد درجہ زور دیتے ہیں۔ بعض جمالیاتی نقاد تو ہیئت کو سب کچھ تصور کرتے ہیں اور اسے زندگی کا اصل راز سمجھتے ہیں۔ اس ضمن میں آسکر وائلڈ کہتا ہے کہ:

"Form is everything. It is the secret of life..... start with the warship of form, and there is no secret in art that will not be revealed to you." 1

آسکر وائلڈ سے دو قدم آگے اس طرز تنقید کا سب سے بڑا مبلغ والٹر پیٹر بھی جمالیاتی نظریے اور تنقید سے متعلق واضح طور پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ اس کی مشہور زمانہ تصنیف The Renaissence میں اس بات کا اعادہ کیا گیا ہے کہ حقیقت زندگی انسانی جذبات و احساسات کا مجموعہ ہے۔ جن سے لکھنے والا اپنا مواد حاصل کرتا ہے جو جمالیات کے پیروکار نقاد ہیں وہ اپنے وجدان کو اپنا راہنما بناتے ہیں اور فن پارے حسن اور حظ کا منبع مرکز تصور کرتے ہیں۔ آسکر وائلڈ داخلیت کو اولیت دیتے ہوئے تخلیقی تنقید پر اسٹریس کرتا ہے۔ اس کے مطابق تنقید تخلیق در تخلیق کا نام ہے اس لیے اسے باہری حوالے یا استفادے کی چنداں ضرورت نہیں۔ وائلڈ کے تنقیدی عروج کو اس تنقیدی نکتے کے

Oscar wilde. The Criticas artist intentions Pg. 201-2, London. 1947

ذریعے تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ اس نے والٹر پیٹر کی مونالیزا کو فن کا سب سے عمدہ نمونہ ثابت کیا ہے اور یہ جمالیات کے دائرے میں آتا ہے۔

جہاں تک اردو میں جمالیاتی طرز تنقید کا سوال ہے تو اس زبان میں اس طرز تنقید کا کوئی پس منظر یا تاریخی تناظر نہیں ملتا۔ لہذا اردو میں فن پاروں کے حسن اور مسرت کی بات فنی باریکی، زبان و بیان اور صنائع بدائع کے احوال تو نظر آتے ہیں لیکن مغرب کی طرح باضابطہ ایک نظریے کے طور پر جمالیات کا اطلاق نظر نہیں آتا۔ اردو میں جمالیتی میلان ورجحان سب سے پہلے مرزا ہادی رسوا کے یہاں دکھائی دیتا ہے۔ رسوؔا ناقد نہیں تھے لیکن ان کے بعض مضامین اس نظریے کی حمایت میں نظر آتے ہیں۔ رسوؔا کے عہد میں اکثر ادباء شعراء مثلاً حالی اور شبلی وغیرہ افادی ادب اور مقصدیت پر زور دیتے ہیں۔ لیکن رسوؔا نے ان سے الگ خالص جمالیتی نقطۂ نظر سے ادب کو دیکھنے اور پرکھنے پر زور دیا ہے۔ بجنوری کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ انہوں نے تنقید میں حسن اور فنون لطیفہ کے متعلق اپنا واضح موقف پیش کیا ہے۔ ان کے مطابق فن کا نصب العین حسن کی جستجو اور مسرت کی تلاش ہے۔ انہوں نے کلام غالب کو سامنے رکھ کر جمالیات کے مختلف گوشوں کو آئینہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ مہدی افادی کا بھی نام اہم ہے۔ وہ حسن کے پرستار ہیں۔ وہ ادب میں صرف حسن اور حسن دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ ''افادات مہدی'' اس کی بین مثال ہے۔ مہدی کے بعد اس سلسلے میں ایک بہت ہی اہم نام نیاز فتح پوری کا بھی ہے۔ جن کی تحریریں جمالیاتی نکات کی تشریح کرتی ہے۔

تاثراتی تنقید:

تاثراتی تنقید کے علمبردار اکثر اپنے جذبات واحساسات کو بہت ہی قطعیت اور اعتماد کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ان کے یہاں منطق اور مصروفیت کی جگہ جوش اور جذبہ کارفرما ہوتا ہے ان کی تنقید ذاتی پسند اور ناپسند پر مبنی ہوتی ہے۔کسی بھی فن پارے کے حسن اور اس کے باریکی کے متعلق ان ے احساسات شدومد کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔والٹر پیٹر نے اس تنقید کے علمبرداروں کے متعلق لکھا ہے کہ:۔

" What is important than is not that the critic should possess a correct defination of beauty for the intellect, but a certain kind of temperament , the power of being deeply moved by the presence of beautiful objects."1

تاثراتی تنقید کے بنیادی نکات کو اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر نیلوفر مرتضٰی نے لکھا ہے:

''(الف) ''نقاد کی سب سے ضروری صفت اس کی حساس

1.Walter Pater. Preface to the renaissance Pg. 27 London1928

طبیعت ہے اسے ایک مخصوص مزاج اور ایسی صلاحیت کا حامل ہونا چاہئے جو اسے حسین چیزوں سے گہرا تاثر قبول کرنے میں مدد دے۔

(ب) فنکار بذات خود حسن سے تاثرات قبول کرنے کے معاملے میں انتہائی حساس ہے۔ فنکار واحد سند یافتہ نقاد ہے۔

(ج) ایک اچھا ناقد سچا ترین فنکار ہوتا ہے۔ یہیں پر جمالیات اور تاثراتی تنقید کے درمیان ایک تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ جمالیاتی نقاد کو ادب میں اجزائے حسن کی تلاش ہوتی ہے۔ اور تاثراتی نقاد نہ صرف اقدار حسن کے معاملے میں گہری اور حساس نگاہ رکھتا ہے بلکہ حسن سے شدید تاثرات قبول کرنے اور ان تاثرات کے بے ساختہ اظہار میں بھی دلچسپی لیتا ہے۔ تاثراتی تنقید کے تعلق سے اہم نظریات کی مزید وضاحت کے لئے اس کے سب سے بڑے علمبردار جویل اسپنگاراں Joel Eliac spingaran کے تنقیدی نظریات و عمل کا علم ضروری ہے۔ اسپنگاراں نے تاثراتی تنقید کو تخلیقی تنقید کا نام دیا اور ایک جداگانہ دبستان کی حیثیت عطا کی۔''[1]

---

[1] اردو تنقید کے نئے دبستانی ابعاد۔ ڈاکٹر نیلوفر مرتضیٰ۔ ۱۹۹۵ء ص۔ ۷۰۔۷۱

اسپنگاراں نے صرف توضیح وتشریح ہی نہیں کی بلکہ اس کی روشنی میں تنقید کے دوسری تمام دبستانوں کوطنز کا ہدف بنایا۔ اس کے مطابق ادبی تنقید کا دائرہ محدود ہے جبکہ تخلیقی تنقید کا دائرہ وسیع ہے اور اور وہ تخلیق کے ذہن وفکر سے تعلق رکھتی ہے۔ اور ناقد فن کار کے احساسات وجذبات کوخود پر طاری کرتا ہے۔ اور تخلیق کے حسن کی گہرائی میں جا پہنچتا ہے۔ وہ حد درجہ حساس، باخبر حس جمال کا مالک ہوتا ہے۔ ساتھ ہی وہ اپنے موقف کے اظہار مں بھی طاق ہوتا ہے۔ تاثراتی ناقد اپنے اسلوب اور طرز تحریر سے ادب کی اس طرح پھر سے تفہیم کرتا ہے کہ قاری کو دوبارہ تخلیقی حظ کا احساس ہوتا ہے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنی تنقید کے ذریعے ایک نئے ادب کو پیش کرتا ہے۔ ان تمام نظریات کی وضاحت اس نے اپنی تصنیف Creative Criticism میں صراحت کے ساتھ کی ہے۔

جہاں تک اردو میں تاثراتی تنقید کی بات ہے تو مہدی افادی، عبدلرحمٰن بجنوری، نیاز فتح پوری، فراق گورکھپوری اور مجنوں گورکھپوری اس طرز تنقید کے حد درجہ اہم نام ہیں جمالیاتی تنقید چونکہ تاثراتی تنقید کے بالکل قریب ہے اس لئے مذکورہ نقادوں کے نام جمالیاتی تنقید کے ضمن میں گزشتہ سطور میں آچکے ہیں۔ مہدی افادی گرچہ باضابطہ نقاد نہیں ہیں لیکن انہوں نے اپنے بیشتر مضامین اور افادات مہدی میں اپنے موقف کا برملا اظہار کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں ایک خاص تاثراتی رجحان ملتا ہے اور اسی کے ذریعے وہ ادبا شعرا کے مقام ومرتبے کا تعین کرتے ہوئے ایک معیار کو برقرار رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں معیار کا مطلب حسن ہوتا ہے۔ جسے وہ ہر حال میں موجود دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ وہ ادب میں حسن بیان کے علاوہ

شوخی اور پر لطف گوئی کو بھی اس زمرے میں شمار کرتے ہیں اس ضمن میں وہ اکبر الہ آبادی کی انشا پردازی کو راہتے ہوئے انہیں انتقادیات عالیہ (Higher Criticism) کے خانے میں رکھتے ہیں۔

افادات مہدی سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

''میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ اکبر کے خیالات دراصل شاعرانہ لٹریچر کے انتقادیات عالیہ (ہائر کریٹی سزم) کے درجہ رکھتے ہیں۔ وہ جہاں شاعر ہیں ادیب بھی ہیں اور ادیب اس پایے کے لئے معمولی صحبتوں میں جو فقرے ان کی زبان سے نکلتے ہیں انشا پردازی کے جواہر ریزے ہوتے ہیں۔''[1]

مہدی کے یہاں شاعروں یعنی شاعری سے زیادہ نثر میں دلچسپی نظر آتی ہے۔ اکبر کی طرح وہ شبلی نعمانی کو بھی اسی بنیاد پر پسند کرتے ہیں کہ ان کی نثر قابل رشک ہے۔ اور ہر جگہ انشا پردازی کے جوہر بکھرے نظر آتے ہیں مہدی کے یہاں بھی دوسرے تاثراتی نقادوں کی طرح حسن، اسلوب اور عبارت کی صوری اور ظاہر جمال پر زور ہے۔ لیکن اکثر مقامات پر ان کے یہ خیالات شدت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور جذباتیت ہر شے پر غالب آجاتی ہے۔

جمالیاتی تنقید کے ذکر کے دوران عبدالرحمٰن بجنوری کے خیالات اور تنقیدی نقطہ نظر سامنے آچکے ہیں۔ عبدالرحمٰن بجنوری نے سب سے پہلے اردو میں مغرب کی جمالیاتی اور تاثراتی تنقید کو جزواً ہی سہی

---

[1] افادات مہدی۔ مہدی افادی۔ ۱۹۵۸۔ سرفراز قومی پریس لکھنؤ، ص۔ ۲۴۶

متعارف کرایا اردو تذکروں اور تنقیدات میں ذاتی تاثرات کی کمی نہیں لیکن بجنوری نے اسے جوش بیان اور ذاتی پسند سے الگ کیا۔ ان کے یہاں اس معاملے میں ذرا احتیاط برتنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بجنوری اپنی مثالیں مشرقی مشاہیر کے بدلے ورڈسورتھ، شیکسپیئر اور گیٹے سے دیتے ہیں اگر وہ غالب کو خاص طور سے اپنی پسند بتاتے ہیں اور ان کے شعری محاسن کو شمار کراتے ہوئے ان کی عظمت میں کئی ایسے جملے اور فقرے ادا کر جاتے ہیں کہ تحیر اور تجسس کا ماحول بن جاتا ہے۔ وہ غالب کی شاعرانہ عظمت کو یوں بیان کرتے ہیں:

''لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے جو یہاں
حاضر نہیں۔ کون سا نغمہ ہے جو اس زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ
موجود نہیں۔''[1]

محولہ بالا اقتباس ہو یا دیوان غالب کو الہامی کتاب بنانے والی بات ہو ہر جگہ بجنوری کے یہاں ذاتی پسند اور ذاتی معیار بندی کا احساس ہوتا ہے۔ عبدالرحمٰن بجنوری کی طرح اس میدان میں نیاز فتح پوری کا نام بھی خاصا اہم ہے۔ انہوں نے اپنی تصنیفات ''انتقادیات'' اور ''مالہ و مالہ علیہ'' (مجموعہ مضامین) کے ذریعے اس نوع کی تنقیدی روش کو خاصا عام کیا۔ انہوں نے اپنے مضامین کے ذریعے تنقید میں جدید اور نئے تقاضوں پر زور دیا لیکن عملی طور پر انہوں نے اپنی پسند اور اپنے ذوق کو اصل رہنما ثابت کیا۔ اس ضمن میں تنقید کے چند دیگر اصول تجویز کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

---

[1] محاسن کلام غالب۔ عبدالرحمٰن بجنوری۔ سرفراز قومی پریس لکھنؤ، ۱۹۵۲۔ ص۔ ۵

''کسی خیال پر نقد کرنے کیلئے سب سے پہلے اصول فطرت پر نظر ڈالنا چاہئے اور یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ خیال کس حد تک درمیانی منازل طے کرتا ہوا فطرت کے ساتھ ساتھ چلا ہے اور اگر کوئی شخص اس طرح فیصلہ کرنے پر قادر ہو تو پھر دوسرا اصول یہ ہے کہ اس کو صرف اپنی ہی رائے پر اعتماد کرنا چاہئے اور یہ سمجھ لینا چاہئے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہی صحیح ہے۔''[1]

محولہ اقتباس سے نیاز کے یہاں قطعیت اور ادعائیت کا اندازہ صاف طور پر لگایا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے اس طرح کی تنقیدی آرا کے ساتھ سائنٹفک انداز یا معروضی طریقہ کار فروغ نہیں پا سکتے۔ تاثراتی تنقید کی یہ قطعیت اسے دوسرے تنقیدی دبستانوں سے الگ کر دیتی ہے۔ تاثراتی تنقید کا ایک بڑا نام فراق گورکھپوری بھی ہے۔ اپنی تصنیف ''اندازے'' کے دیباچے میں فراق اس بابت وضاحت کی ہے کہ وہ وجدان کو اولیت دیتے ہیں۔ اور مغربی تاثراتی تنقید کے حامی ہیں۔ انہوں نے مصحفی کے کلام کو تاثراتی انداز نقد کے ذریعے پیش کیا۔ مجنوں گورکھپوری بھی تاثراتی تنقید کے اہم نقاد ہیں ان کی کتاب پردیسی کے خطوط فرضی نوعیت کے ہیں اس لئے ان میں ذاتی تاثرات کی پیش کش کی بہت گنجائش تھی۔ مجنوں کے یہاں شاعر و ادیب کی شخصیت اور فن سے زیادہ اپنی پسند اور اپنے نقطہ پر زیادہ زور ملتا ہے۔ اس ضمن میں ان کے یہاں بھی شدت پائی جاتی ہے۔

---

[1] انتقادیات جلد دوم۔ نیاز فتح پوری۔ برقی پریس حیدر آباد۔ ۱۹۴۴ء۔ ص۔ ۲۳

نفسیاتی تنقید(Psychological Criticism):

نفسیاتی تنقید کا اولین بنیاد گزار سگمنڈ فرائڈ تھا۔ آگے چل کر دوسرے مفکرین میں ایڈلر اور ژنگ کے افکار نے مزید وسعت پیدا کی۔ ادب میں نفسیات کی باریکیوں پر قبل میں بھی اشارے ملتے ہیں۔ لیکن اسے باضابطہ طور پر مذکورہ مفکرین نے ادب میں داخل کیا۔ اور فن پارے کے تجزیے اور تحلیل کے لئے نفسیاتی طریقہ کار کو اپنایا جانے لگا۔ گرچہ یہ طریقہ کار بہت قدیم نہیں تھا لیکن ادب میں اس کی مقبولیت بہت تیزی سے بڑھی۔ حالانکہ رومانی نقادوں نے بھی شاعر، شاعر کا پس منظر، نفسیاتی اور تخلیقی عمل پر زور دیا ہے رومانی نقادوں کے مطابق فن کار کی ذہنی حالت کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ ان کا ماننا تھا کہ کسی خاص قسم کا فن پارہ صرف خاص طرح کی ذہنی حالت ہی پیدا کر سکتی ہے۔ اس تنقید کے نقادوں نے خود آگہی، عرفان ذت اور تحلیل نفسی پر ہمیشہ زور دیا۔

کولرج اپنے ہم عصروں میں حد درجہ ذہین اور باشعور تھا وہ جرمن فلسفیوں سے متاثر تھا۔ اور ان کے فلسفیانہ افکار نے اسکے ذہن کو جدید نفسیات کی افہام وتفہیم کی طرف راغب کیا۔ کولرج کی کوششوں کو سامنے رکھیں تو معلوم ہوگا کہ اس نے نہ صرف لاشعور کو تخیل کا سرچشمہ قرار دیا بلکہ ادبی تنقید میں نفسیات یعنی Psychology لفظ بھی پہلی دفعہ اسی نے رائج کیا۔

ان انفرای اور جستہ جستہ مثالوں سے الگ اگر نفسیاتی تنقید کے مخصوص مباحث کی عمومی درجہ بندی کی جائے تو بقول سلیم اختر وہ کچھ یوں ہوگی۔

(الف) ''مختلف اصناف ادب کے نفسیاتی محرکات کا سراغ وضاحت اور تخلیقی عمل یا مخصوص تخلیقات سے ان کے رابطہ کی تفہیم

(ب) تخلیق کار کی شخصیت کی نفسی اساس کی دریافت اور پھر اس کی روشنی میں تخلیقی شخصیت کا مطالعہ

(ج) نفسیاتی اصولوں کے سیاق وسباق میں مخصوص تخلیقی کاوشوں کی تشریح وتوضیح اور پھر ان کے ادبی مرتبہ کا تعین۔ نفسیاتی تنقید کے دائرہ عمل کی اس تکون سے واضح ہو جاتا ہے کہ نفسیاتی نقاد بیک وقت تخلیق اور تخلیق کار کے مطالعہ سے کسی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ تخلیقی عمل تخلیق کار میں بعض ایسے مخصوص تغیرات کا موجب بنتا ہے جو اس کی شخصیت کے لئے مخصوص نفسی فوائد کا باعث بنتے ہیں اور یوں ایک کے مطالعہ کو دوسرے کا مطالعہ لازم قرار پاتا ہے۔ اگر نفسیاتی نقاد محض تخلیق کار تک ہی خود کو محدود رکھے تو یہ نفسی معالج کا کام کرنے والی بات ہوگی۔ اس کے برعکس وہ تخلیقات ہی کی نفسیاتی چھان پھٹک میں الجھا رہے تو یہ ہوا میں تیر چلانے والی بات ہوگی۔ نفسیاتی تنقید سے پہلے تاریخی اور عمرانی تنقید کے دبستانوں میں بھی تخلیق کار کی شخصیت اور اس کے کرداری محرکات کی پیچیدگیوں کی تفہیم

پر زور دیا جاتا رہا ہے۔ لیکن نفسیاتی تنقید یوں بے حد اہمیت اختیار کر جاتی ہے کہ اس میں پہلی مرتبہ تخلیق کی نفسی اساس اور کرداری محرکات کی تلاش میں گہرائی اور ژرف نگاہی کے ساتھ ساتھ سائنسی بلکہ طبی تحقیقات (کیونکہ ایک مرحلہ پر نفسیات علم الادویہ سے جا ملتی ہے) کو بروئے کار لانا ممکن ہو گیا۔ یوں تنقید کی تاریخ میں پہلی مرتبہ تخلیق اور تخلیق کار دونوں کو نفسیات کے محدب شیشہ میں رکھ کر ان کی پیچیدگیوں اور باہمی اثر پذیری کا مطالعہ ممکن ہو گیا۔''[1]

مندرجہ بالا اقتباس کے پیش نظر جب نفسیاتی تنقید کے اثرات پر نظر ڈالتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا دائرہ کار بہت وسیع ہے۔ اس کے دائرے میں تخلیق کار کی شخصیت اس کے شعور اور لاشعور کی تحلیل نفسی کی جاتی ہے۔ اور ساتھ ہی قاری پر مرتب ہونے والے اثرات کو بھی پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ اردو میں آر کی ٹائپ تنقید اسی دائرے میں آتی ہے۔

جیسا کہ گزشتہ سطور میں عرض کیا گیا کہ اردو میں مرزا ہادی رسوا کے یہاں جدید تنقیدی نظریات کی پیش کش سب سے پہلے نظر آتی ہے۔ لہٰذا نفسیاتی تنقید بھی پہلے پہل انہیں کے یہاں نظر آتی ہے۔ حالانکہ رسوا سے قبل حالی اور شبلی کے یہاں بھی فنون لطیفہ اور تخیل وغیرہ کے موضوعات پر تحریریں ملتی ہیں لیکن رسوا

---

[1] تنقیدی دبستان۔ ڈاکٹر سلیم اختر۔ دہلی۔ ۲۰۰۹۔ ص۔ ۱۵۴۔۱۵۵

کے یہاں عمداً اس روش کی طرف توجہ نظر آتی ہے۔ مرزا ہادی رسوا نے انسانی احساسات کی خانہ بندی کرتے ہوئے اسے تین درجوں میں رکھا ہے۔ یعنی شعور، وجدان اور ارادہ۔ رسوا کے مطابق خیال میں ادراک، استدلال اور تمثیل انسانی ذہن کے مخصوص حصے ہیں اور یہ عین فطرت ہیں۔ مراسلات رسوا میں ان خیالات کو بالتفصیل ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ تشبیہ اور استعارے کی خصوصیت کو ان کے حوالے سے بیان کرتے ہوئے پروفیسر محمد حسن نے لکھا ہے کہ:

> ''تشبیہ کا مقصد یہ ہے کہ الفاظ کو زیادہ پر زور اور وسیع تر اظہار کی قوت بخشی جائے کیونکہ تشبیہ حقیقی الم و لذت کا تصور پیدا کر کے اعصاب کو متاثر کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ مرزا استعارے کو نفسیاتی اثر کے اعتبار سے تشبیہ سے برتر مانتے ہیں۔ استعارہ دو مماثل چیزوں کی باہمی مماثلت کا بیان نہیں کرتا بلکہ ان کا ایک مشترک تصور پیش کرتا ہے۔ استعارے کے استعمال میں ذہنی قوتوں کا استعمال زیادہ قوت اور گہرائی سے ہوتا ہے۔''[1]

مختصر یہ کہ رسوا نے اپنی تحاریر کے ذریعے جن نفسیاتی بصیرتوں کا اظہار کیا انہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں اکثر مقامات پر جن دماغی قوتوں کی طرف اشارہ کیا ہے وہ ایک

---

[1] مراسلات رسوا۔ مرزا محمد ہادی رسوا۔ مرتب ڈاکٹر محمد حسن۔ مسلم ایجوکیشنل پریس، علیگڑھ۔ ۱۹۴۱۔ ص۔ ۴۳

گہرے نفسیات شعور کی عمدہ مثال ہے۔ رسوا کے بعد مولانا وحیدالدین سلیم نے بھی نفسیات کے موضوع پر مضامین لکھے ہیں۔ ''افادات سلیم' کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے قصد کر کے نفسیات کی روشنی میں ادبا شعرا کی تحریروں کو دیکھا ہے اور ان پر بحثیں بھی کی ہیں۔ میر تقی میر کی شاعری یہاں بطور مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ جس کی داخلی کیفیات اور ذہنی عوامل کو نفسیات کی رو سے سلیم نے جانچنے پرکھنے کی سعی کی ہے۔

میراجی اردو کے ایک جدید اور معروف نظم گو شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنی نظموں مں جنسی موشگافیوں کو پیش کیا ہے۔ اور لاشعوری علامتوں کے ذریعے اردو شاعری کو ایک نیا لہجہ دینے کا کام کیا ہے۔ اردو کے نفسیاتی نقادوں میں گرچہ ریاض احمد بہت معروف نام نہیں ہے۔ لیکن اس ناقد نے پہلی دفعہ نفسیاتی دبستان کے اصول اور ضابطے سے بنیادی نوعیت کی بحث کی ہے۔ ریاض احمد معروف ناقد یونگ سے متاثر نظر آتے ہیں انہوں نے اپنے مضمون 'اردو تنقید کا نفسیاتی دبستان'' میں اس بات کا اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ واہمے کی تخلیقی اہمیت سے یونگ واقف تھا اور قائل بھی تھا۔ اپنے مضمون ''نقطہ نظر کی تلاش میں'' وہ انسانی واہموں کو حقیقت قرار دیتے ہوئے صاف طور پر واضح کرتے ہیں:

> ''واہمہ کو منطقی اعتبار سے کوئی اہمیت حاصل ہو یا نہ ہو لیکن واہمہ ایک حقیقت ہے۔''[1]

---

[1] تنقیدی مسائل۔ ریاض احمد۔ استقلال پریس لاہور۔ ۱۹۶۱۔ ص۔ ۱۷

ریاض احمد کے علاوہ اس ضمن میں شبیہ الحسن بھی ایک اہم نام ہے۔ ان کی کتاب ''تنقید و تحلیل'' نفسیاتی اصولوں اور تحلیل نفسی کے ساتھ سماجی و تہذیبی حالات کو پیش کرتی ہے۔ ان کا مضمون ''غزل میں نرگسیت'' ان کے نفسیاتی شعور اور علم و اگہی کے شواہد پیش کرتا ہے۔ ان نقادوں کے علاوہ ڈاکٹر وزیر آغا، سلیم احمد وغیرہ بھی نفسیاتی تنقید کے دبستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان کی تحریرات و تخلیقات بھی فن اور فن کار کے داخلی کوائف اور باریکیوں کو پیش کر کے مطالعے کے کئی در وا کرتی ہیں۔

مارکسی تنقید (Marxist Criticism)

مارکسی تنقید دوسرے تنقیدی دبستانوں سے ان معنوں میں مختلف ہے کہ یہ خالصتاً معاشرے کو اپنا موضوع بناتی ہے۔ اور معاشرے کی تشکیل اور اس کے اسباب کو بحث کا موضوع بناتی ہے۔ یہ طرز تنقید اس لئے بھی منفرد ہے کہ اس کا تعلق براہ راست ادب سے نہ تھا یہ سماج اور معاشرے کے لئے تھا بلکہ یہ بھی نفسیاتی تنقید کی طرح انسانی زندگی کے مخصوص گوشوں تک محدود تھا۔ مارکسی تنقید کی بنیاد چونکہ اشتراکیت تھی اس لئے اشتراکیت کی تفہیم یہاں لازمی ہے۔ مارکس نے سماج کے بننے اور اس کے ارتقا پذیر ہونے کے عمل کو ''مادی جدلیت'' یعنی (Material Dialectics) کا نام دیا۔ مارکس کے مطابق زندگی اور اس کے مادی تقاضے پہلے پہل Production کے طریقے کو بدل کر آلات زر میں تغیر و تبدل پیدا کرتے ہیں بعد میں یہی پیداوار کے طریقے اور آلات دونوں مل کر سماج میں ہر طرح کے بدلاؤ کا راستہ ہموار کرتے ہیں۔ مارکس کی فکر سے قبل انسانی عقل و شعور کو اولیت حاصل تھی۔ لیکن مارکس نے اسے رد

کر۔تے ہوئے مادی اسباب پر زور دیا۔اوراسی سماجی اسباب کوانسانی عقل وشعور کامنبع قرار دیا۔مارکس کی یہ فکراپنے عہد میں دوسرے تمام افکار سے علاحدہ تھی۔آگے چل کراینگلز نے مارکس کی آواز میں آواز ملائی اوران آوازوں نے پہلے سے موجودتمام افکارکو بدل کررکھ دیا۔ماضی کے تمام خیالات غلط اور بے معنی قراردیئے گئے۔یہی وہ اسباب تھے کہ کمیونسٹ پارٹی نے ہراس سطح پراحتجاج کی صدابلند کی جہاں سماجی نابرابری اوراستحصال کا بازارگرم تھا۔بقول سلیم اختر کمیونسٹ پارٹی کے مینی فیسٹو کا اختتام ان سطروں پر ہواتھا کہ:

''کمیونسٹ ہرجگہ موجودہ سماجی اورسیاسی نظام کے خلاف ہرانقلابی تحریک کی مدد کرتے ہیں۔ان تمام تحریکوں میں وہ ملکیت کے سوال کو ہر تحریک کے سب سے اہم سوال کی حیثیت سے سامنے لاتے ہیں۔خواہ وہ اس وقت اپنی نشوونما کے کسی بھی مرحلے میں کیوں نہ ہواورسب سے آخر میں یہ کہ وہ ہمیشہ ملکوں کی جمہوری پارٹیوں میں اتحادو یک جہتی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اپنے خیالات اور مقاصد کو چھپانا کمیونسٹ اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔وہ برملا اعلان کرتے ہیں کہ ان کا اصلی مقصداسی وقت پورا ہوسکتاہے جب کہ موجودہ سماجی نظام کا تختہ بزور الٹ دیا جائے۔ کمیونسٹ انقلاب کے خوف سے برسراقتدارطبقوں کولرزنے اورمزدوروں

کے پاس کھونے کیلئے اپنی زنجیروں کے سوا ہے ہی کیا اور جیتنے کیلئے تو ساری دنیا پڑی ہے۔تمام ملکوں کے محنت کش انسانو! متحد ہو جاؤ۔''[1]

اس کمیونسٹ منشور کو پیش نظر رکھا جائے تو احساس ہوگا کہ اس میں شامل تمام عناصر کو ادیبوں شاعروں نے اپنے فن پاروں میں برتنے کی کوشش کی اور مارکسی نقادوں نے زندگی اور سماج کے مادی ارتقا میں شامل ہونے کے ساتھ مختلف درپیش مرحلوں کو بھی پیش کیا۔ مارکسی نقاد چونکہ ایک خاص نظریہ کے حامی اور علمبردار تھے اس لئے انہوں نے ادب میں ظالم اور مظلوم، سرمایہ دار اور مزدور دونوں کو الگ الگ خانوں میں رکھا۔ ایک طبقہ ان کے نزدیک غاصب تھا تو دوسرا طبقہ انصاف کا مستحق۔ اس لئے مارکسی نقادوں نے غریب اور مستحصل طبقے کی حمایت کی۔ میکسم گورکی نے اس حمایت کو صاف لفظوں میں واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ہماری تمام تصنیفات کا ہیرو مزدور ہونا چاہئے بالفاظ دیگر محنت کے عمل سے جنم لینے والا۔ انسان۔''[2]

گورکی اور دوسرے مارکسی نقادوں کے مطابق جو ادب صرف تفریح اور تعیش کے لئے تخلیق کیا جاتا ہے اور انسان کی اصل اور تلخ زندگی سے اس کا کوئی سروکار نہیں ہوتا ہے تو اس کا کوئی مصرف نہیں۔ اس لئے

---

[1] تنقیدی دبستان۔ ڈاکٹر سلیم اختر بک کارپوریشن۔ دہلی۔ ۲۰۰۹۔ ص۔ ۱۷۶

[2] Maxim Gorky. Life and literature Pg. 135

اسے ضائع کر دینا چاہئے۔ اسلئے کہ زندگی اور ادب کا بہر حال مرکز آدمی ہی ہوتا ہے اور آدمی کے اصل حالات سے نظریں چرا کر ادب تخلیق کرنا لایعنی اور بے معنی ہے۔ اس ضمن میں گورکی مزید روشنی ڈالتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

> ''میرے خیال میں تو انسان سے ماورا اور کچھ نہیں اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ انسان اور صرف انسان ہی تمام اشیاء خیالات اور تصورات کا خالق ہے۔ تمام معجزہ ہائے ہنر اسی کے مرہون منت ہیں۔ فطرت کی تمام قوتوں پر مستقبل میں وہی غلبہ پا کر انہیں اپنا محکوم بنالے گا۔ اس دنیا کی حسین ترین اشیاء، ماہر فن اور دست محنت شعار کی مرہون منت ہیں۔ ہمارے تمام خیالات اور تصورات نے محنت کے عمل سے جنم لی ہے۔ فنون علوم اور ٹکنالوجی کی تمام تاریخ اس امر کی شاہد ہے۔ خیالات حقائق کے جلو میں ہوتے ہیں۔''[1]

محولہ بالا اقتباس کا لب لباب یہ ہے کہ مزدور اور محنت کش طبقہ ہی دنیا کا رخ طے کرتا ہے۔ اور مختلف فنون اور علوم پر اس طبقے کے حالات و احوال اثرات انداز ہوتے ہیں۔ اس لئے مارکسی تنقید اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کرتی۔ وہ خیالی اور تصوراتی دنیا سے الگ معروضی اور سائنسی نقطہ نظر اپناتی ہے۔ وہ

---

[1] Maxim Gorky. Life and Literature. Pg. 56

ادب اور سماج کے مختلف عوامل اور محرکات کا مطالعہ کرتی ہے ۔اور ادب کو سماج کے ساتھ سیاست کے قریب بھی کرتی ہے۔اسلئے کہ ادب ایک بڑی آبادی کے لئے تخلیق کیا جاتا ہے اس لئے اس بڑی آبادی کو کسی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔اور ادب کے ذریعے ہر طرح کے سیاسی مقصد اور اس کی تبلیغ ممکن ہو سکتے ہیں۔

اردو میں مارکسی تنقید ترقی پسند تحریک کے بعد سامنے آئی۔لیکن مارکسی تنقید اور ترقی پسند تنقید میں ایک فرق یہ ہے کہ مارکسی تنقید ہر حال میں اشتراکی نظریہ کو سامنے رکھتی ہے۔وہ مارکسی نظریے سے الگ نہیں ہوسکتی جبکہ ترقی پسند تنقید بیشتر مارکسی خیالات کو ہی پیش کرتی ہے لیکن ہر ترقی پسند ناقد کیلئے یہ لازمی نہیں ہے کہ وہ مارکسی ضابطے و نظریے کو ہر حال میں Follow کرے۔ اردو میں ترقی پسند ادیبوں اور نقادوں نے ادب برائے زندگی کا نعرہ پیش کیا۔اس سلسلے میں سب سے پہلے اختر حسین رائے پوری نے اس طرز تنقید کا خاکہ تیار کیا اور ایک اعلان نامہ ترتیب دیا جو زندگی سے ادب کو قریب تر کرنے پر مشتمل تھا۔ اس اعلان نامہ کو منشی پریم چند، مولوی عبدالحق ، جواہر لعل نہرو وغیرہ نے اپنی حمایت دی۔اس اعلان نامہ میں ادب کو ذاتی اظہار اور انفرادی شغل کے بدلے زندگی کا حقیقی ترجمان بنانے پر زور دیا گیا تھا۔اختر حسین رائے پوری نے اپنی تصنیف ادب اور انقلاب میں اپنے نظریات کو صراحت کے ساتھ پیش کرتے ہوئے لکھا کہ ادیب کی کچھ سماجی ذمہ داریاں ہونی چاہئیں اس لئے اس کی ذہن سازی ضروری ہے۔ کیونکہ ادب آرام طلبی اور تعیش پسندی کی چیز نہیں بلکہ زندگی کی گہرائیوں اور اس کے مسائل و مصائب سے

آنکھیں چار کرنے کی شے ہے۔ زندگی کو سمجھنے کیلئے آگ میں تپنا پڑتا ہے۔ لوگوں کی زندگی سے دور رہ کر ان کے جذبات و احساسات کو نہ خود سمجھا جاسکتا ہے اور نہ دوسروں کو بتایا جاسکتا ہے۔ اختر حسین رائے پوری نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے ارکان کو مخاطب کرتے ہوئے صاف طور پر لکھا ہے کہ:

''اس انجمن کا کام یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا کہ ہم کبھی کبھار مل بیٹھیں اور بحث و مباحثہ کے بعد اپنے گھر کی راہ لیں اور کان میں تیل ڈال کر سو جائیں..... انجمن کے ارکان ٹولی بنا کر سال میں ایک دو مرتبہ کسانوں یا مزدوروں کے ساتھ جا کر رہیں تا کہ عوام کی زندگی سے ان کا براہ رست تعلق پیدا ہو سکے۔''[1]

اختر حسین رائے پوری کے مطابق ادب کو انسان سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔ کیونکہ سچا اور زندہ ادب سماج سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے ادیبوں کو انہیں اصولوں پر کاربند ہونا چاہئے جو انسانی جذبات کی ترجمانی کرے۔ جو انسانی ترقی کا سبب بنیں اور ہر طرح کی ناانصافی اور نابرابری کو ختم کر کے عالمی اخوت اور ہم آہنگی کا ماحول سازگار بنائیں۔ وہ قدیم ادب کے موضوعات اس کی زبان اور اس کے جمالیاتی اسلوب کے رد کرتے ہوئے جوش، میر، سودا، وغیرہ کے کلام کو بے معنی قرار دیتے ہیں اور اس کیلئے مختلف توضیحات پیش کرتے ہیں۔ لیکن یہ توضیحات زیادہ تر شدت اور انتہا پسندی کا نمونہ بن جاتی ہیں۔

---

[1] ادب اور انقلاب۔ اختر حسین رائے پوری۔ قادری پریس۔ ممبئی۔ ص۔ ۸۷۔۸۸

مجنوں گورکھپوری کا ذکر گزشتہ سطور میں جمالیاتی اور تاثراتی تنقید کے باب میں آچکا ہے لیکن ترقی پسند تحریک سے قربت کے سبب ان کے یہاں بھی ادب کے افادی پہلو پر زور نظر آتا ہے۔ وہ ادب میں سائنسی نظریہ کی حمایت کرتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب ''ادب اور زندگی'' میں زندگی اور معاشرے کے باہمی رشتے کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ مجنوں، مارکسزم اور اس کے افکار سے واقف تھے اس لئے وہ اپنی کتاب میں اس فلسفے پر اور اس کے ادبی اصولوں پر بحث کرتے ہیں۔ ادب کے متعلق مجنوں کا موقف ہے کہ انسان تمام سماجی حرکات وسکنات و مادی اشیا سے روبرو ہوتا ہے اس لئے وہ خارجی حالات سے الگ نہیں ہوسکتا۔ ادب اور اس کے مقاصد کے درمیان بظاہر کوئی راست تعلق نہیں ہوتا اس لئے ادب کو زندگی کا ترجمان تو ہونا چاہئے لیکن تبلیغ نہیں ہونا چاہئے۔ مجنوں گورکھپوری اینجلز سے متاثر ہیں اسلئے وہ اشتراکیت کے مثبت پہلوؤں کو اپناتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک اقتباس دیکھیں:

> ''ادب ڈھنڈورے کے قسم کی چیز نہیں ہے اور ادیب نہ کوئی ڈھنڈورچی ہوتا ہے۔ نہ مبلغ لیکن اس اعتبار سے ادب یقیناً ایک طرح کی تبلیغ و اشاعت ہے کہ اس کے اندر ایک چھپا ہوا اور غیر محسوس غایتی میلان ہوتا ہے جو اس کا ایک اہم ترکیبی جزو ہوتا ہے جو ادب اس میلان سے خالی ہے وہ ادب نہیں ہے۔''[1]

اس اقتباس سے یہ انداز ہوتا ہے کہ ادب میں تبلیغ و اشاعت ظاہری اور دکھاوے کے طور پر نہ ہو بلکہ

وہ انیجلز کے دبے ہوئے اور مخفی غایتی میلان کے نظریے کے مطابق ہو یعنی مقصد بھی پورا ہو جائے اور ادب، ادب بھی باقی رہ جائے۔ مجنوں کی تحریریں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ اشتراکیت کے قریب تو ضرور ہیں لیکن اپنی تحریروں میں وہ اختر حسین رائے پوری کی طرح متشدد اور انتہا پسند نہیں ہیں۔ ان کے یہاں ایک اعتدال اور توازن کا وصف ہے جو ہر جگہ قائم رہتا ہے۔

مجنوں کے بعد پروفیسر احتشام حسین مارکسی نقادوں میں بہت اہم مانے جاتے ہیں۔ ان کی تنقید کی اساس مارکس کی مادی جدلیت پر ہے۔ وہ ادب کو زندگی کے عام شعور کا ایک اٹوٹ حصہ سمجھتے ہیں جس میں طبقاتی رجحانات سانس لیتے ہیں۔ اور تمدن کے مظاہر اثر انداز ہوتے ہیں۔ سید احتشام حسین ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے حوالے سے جو نظریات پیش کئے وہ ان کی مختلف تصنیفات میں موجود ہیں۔ جن کے مطالعے سے ان کے نظریے اور اصول کی بابت واقفیت ہوتی ہے۔ ان کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر نیلوفر مرتضی نے لکھا ہے:

> '' احتشام حسین نے ادب برائے ادب کے نظریے کو انحطاطی تصور ادب قرار دیا اور ادب برائے زندگی کے نظریے کی حمایت کی۔ وہ ادب اور فنون لطیفہ کو الہامی چیز سمجھنے کے بجائے سماجی زندگی کا مظہر سمجھتے ہیں۔ ادیب و نقاد اپنے ماحول اور سماج کا پروردہ ہوتا ہے۔ نقاد کا اپنا ایک

---

[1] ادب اور مقصد (ادب اور زندگی) مجنوں گورکھپوری۔ شیروانی آفسیٹ پریس دہلی۔۱۹۸۴۔ص۔۳۹

نقطہ نظر ہوتا ہے جس کی روشنی میں وہ اپنے مقصد کا تعین کرتا ہے۔ اس نقطہ نظر کی تشکیل خارجی محرکات کے زیر اثر ہوتی ہے۔''[1]

درج بالا اقتباس کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ احتشام حسین کے یہاں بھی اعتدال کی روشنی نظر آتی ہے۔ کیونکہ وہ اکثر مقامات پر صحت مند افکار اور سائنٹفک نظریے کے حامی نظر آتے ہیں۔ سائنٹفک نقطہ نظر کے متعلق خود ان کا بیان ملاحظہ کریں:

''سائنٹفک نقطہ نظر وہ ہے جو ادب کو زندگی کے معاشی، معاشرتی اور طبقاتی روابط کے ساتھ متحرک اور تغیر پذیر دیکھتا ہے۔ یہ ایک ہمہ گیر نقطہ نظر ہے اور ادبی مطالعہ کے کسی اہم پہلو کو نظر انداز نہیں کرتا۔''[2]

احتشام حسین کے یہاں تاریخی عناصر کی موجودگی ہر جگہ ملتی ہے۔ ان کے مطابق نئے ادبی میلانات تاریخی حقائق کے بغیر منصۂ شہود پر نہیں آ سکتے اس لئے ان کو نظر میں رکھنا صحت مند اور بامعنی تنقید کے لئے از حد لازمی ہے۔ سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کے بنیاد گزاروں میں ہیں۔ انہوں نے اس تحریک کی بنیاد لندن میں اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر ڈالی تھی لندن سے لے کر ہندستان کے گوشے گوشے میں اپنے منشور اور اپنی عملی سرگرمیوں کے ذریعہ انہوں نے اس تحریک کو متعارف کرایا۔ سجاد ظہیر اشتراکی خیالات اور جدلیاتی

---

[1] اردو تنقید کے نئے دبستان۔ ڈاکٹر نیلوفر مرتضی۔ آفسیٹ پریس کلکتہ۔ ۱۹۹۵۔ ص۔ ۱۳۹

[2] دیباچہ۔ تنقیدی جائزے۔ احتشام حسین۔ رزاقی شین پریس۔ حیدر آباد۔ ۱۴۴۔ ص۔ ۱۰

مادیت کو فالو کرتے ہیں۔ ان کے مطابق ادب سماجی اور معاشی تبدیلی کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ ان کے یہاں تغیرات اور مادیت ہی نہیں معاشرہ اور معاشرتی احوال کا ادراک ملتا ہے۔ ان کی تصنیف ''روشنائی'' اس سلسلے کی بنیادی کتاب ہے۔ سجاد ظہیر کے علاوہ اس دبستان تنقید کا ایک اہم نام ڈاکٹر عبدالعلیم کا بھی ہے۔ 'ادبی تنقید' اور 'مارکسی تنقید' جیسے مضامین ان کی فکر اور رجحان کو واضح کرتے ہیں۔ ان نقادوں کے علاوہ اختر انصاری اور آل احمد سرور کے یہاں بھی ادب اور سماج کے تعلق سے ایک رچا ہوا شعور ملتا ہے۔ معروف شاعر اور نقاد علی سردار جعفری کا ذکر یہاں نہ کیا جائے تو بات نامکمل رہے گی۔ انہوں نے اس تحریک کو مقبول عام بنانے میں اہم رول ادا کیا۔ ان کی تصنیف ''ترقی پسند ادب'' ایک طرح سے ترقی پسند تحریک کی مکمل داستان ہے۔ یہ تنقید بھی ہے اور تاریخ بھی ہے۔ علی سردار جعفری مارکسی نقادوں میں بعد کے زمانے کے سب سے اہم نقاد کے طور پر اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ علی سردار جعفری ادبی موضوعات پر خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ وہ ادب میں موضوع کے انتخاب اور اس کے استعمال پر زور دیتے ہیں۔ ان کے مطابق موضوع کو انسان کی زندگی اور اس کے معاشرے سے الگ نہیں ہونا چاہئے۔ غربت، مفلوک الحالی ، استحصال اور ظلم و جبر جو صدیوں سے سماج میں رائج رہا ہے، جعفری اس کو ختم کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ اس لئے ادبی موضوعات کی سماجی اہمیت پر وہ ہمیشہ لازمی قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ اپنی کتاب ''ترقی پسند ادب'' میں رقم طراز ہیں:

'' موضوع کی سماجی اہمیت ہونی چاہئے۔ یعنی ایسا موضوع ہو جو

انسانوں کی زندگی ، ماحول، ٹکراؤ، تضاد، جدوجہد، کشمکش، جنبش اور حرکت

کا ترجمان ہو جس کے ذریعے سے سماج اور تاریخ کے عوامل اور روابط

نمایاں ہو سکیں یعنی موضوع حقیقی اور سچا ہونا چاہئے۔''[1]

محولہ اقتباس سے علی سردار جعفری کے موقف اور نظریے کی بابت پوری واقفیت ہو جاتی ہے۔ ساتھ ہی مارکسی یا اشتراکی تنقید کے خدوخال بھی ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔

گزشتہ میں جن تنقیدی دبستانوں کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ان کے علاوہ بھی تنقید دبستان اور رجحانات ہیں، جو مختلف اوقات میں منصۂ شہود پر آئے اور ادب کو متاثر کرنے کا کام اور ان میں سے کچھ ہنوز متاثر کرنے کا کام کر رہے ہے۔ مذکورہ تنقیدی دبستانوں کے علاوہ

تقابلی تنقید

روحانی تنقید

تاریخی تنقید

تشریحی تنقید

عمرانی تنقید

ہیئتی تنقید

---

[1] ترقی پسند ادب۔ جلد اول۔ علی سردار جعفری۔ انجمن ترقی اردو، علیگڑھ۔ ص۔ ۷۵

اسلوبیاتی تنقید

ساختیاتی تنقید

امریکن تنقیدی دبستان وغیرہ بھی ہیں جو دبستان تنقید کے زمرے میں آتے ہیں۔ اور ادب کو کسی نہ کسی طور پر روشنی اور سمت دکھانے کا کام کرتے ہیں۔ اس مختصر سے باب میں فی الحال انہیں سطور پر گفتگو کو ختم کیا جاتا ہے۔

☆

باب سوم

ترقی پسند تحریک کا سیاسی، سماجی اور ادبی پس منظر

ترقی پسند تحریک کا سیاسی، سماجی اور ادبی پس منظر

اردو ادب میں علی گڑھ تحریک کے بعد ترقی پسند تحریک سب سے بڑی اور باضابطہ تحریک تھی۔ اس تحریک کی بنیاد یوں تو لندن میں سجاد ظہیر اور ان کے احباب کے ذریعے رکھی گئی لیکن ہندوستان میں غدر اور اس کے بعد کی شکست وریخت نے سرسید اور ان کے رفقاء کو متاثر کیا اور علی گڑھ تحریک سامنے آئی۔ اس لیے یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ ترقی پسند تحریک کے لیے علی گڑھ تحریک ہی محرک بنی۔ ان دونوں تحریکات نے جس طرح اردو زبان اور ادب کو بڑے پیمانے پر متاثر کیا، اس کی نظیر اور کہیں نہیں ملتی۔ ترقی پسند تحریک کا براہ راست تعلق فن کار اور فن پاروں سے تھا لیکن اس اختصاص اور امتیاز کے ساتھ کہ ادب میں سیاسی سماجی اور معاشی صورتحال کی عکاسی ہو اور ادب کو زندگی کا سچا آئینہ بنایا جائے۔ جس طرح علی گڑھ تحریک کے آغاز کا پس منظر تھا اسی طرح ترقی پسند تحریک کی ابتدا کا بھی واضح پس منظر تھا۔ دنیا بہت برق رفتاری سے بدل رہی تھی۔ صنعتی انقلاب، نت نئی سائنسی ایجادات، نئے علوم وفنون اور متنوع ادبی نظریات وافکار ادب اور سماج پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ فرسودہ اور استحصالی نظام اور نئی تعمیری فکر کے

درمیان تصادم اور کشمکش کی راہ ہموار ہو رہی تھی۔ ایک طرف سرمایہ دارانہ نظام تھا تو دوسری طرف سوشلزم اور اشتراکیت تھی۔ دونوں افکار ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ۱۹۰۵ء اور ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب نے سماج کو اور بھی واضح طور پر دو طبقوں میں تقسیم کر دیا۔ روسی انقلاب کے بعد جرمنی، بلغاریہ اور دوسرے کئے ملکوں میں ظلم و جبر کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوئی۔ ردعمل کے طور پر فاشزم کے عتاب باہر جیسے فن کار اور آئن اسٹائن جیسے سائنس داں پر نازل ہوئے اور انہیں ملک سے باہر جانا پڑا۔ پورے یورپ میں نئے افکار و نظریات کے خلاف ایک علامتی جنگ جاری تھی۔ یہی وہ موقع تھا روشن خیال ادیبوں کو جمع ہونے کا۔ دنیا بھر کے مثبت اور تعمیر پسند ادباء شعراء نے انسانیت کی بقا کے لیے آواز اٹھائی اور بڑی تعداد میں ان منفی اور غاصبانہ قوتوں کے خلاف صف آرا ہوئے۔ سجاد ظہیر نے اس صورتحال کو بیان کرتے ہوئے لکھا کہ:

> ''ہم کو لندن اور پیرس میں جرمنی سے بھاگے نکالے ہوئے مصیبت زدہ لوگ روز ملتے تھے۔ فاشزم کے ظلم کی درد بھری کہانیاں ہر طرف سنائی دیتیں۔ جرمنی میں آزادی پسندوں اور کمیونسٹوں کے سرمایہ داروں کے غنڈے طرح طرح کی جسمانی اذیتیں پہنچا رہے تھے۔ وہ ہولناک تصویریں جن میں عوام الناس کے ہر دل عزیز لیڈروں کی پیٹھ اور کولھے کوڑوں کے نشانوں سے کالے پڑے ہوئے دکھائی دیتے وہ خوفناک واقعات جو واقعتاً کسی بڑے کمیونسٹ لیڈر کے جلاد کے ہتھوڑے سے سر قلم

ہونے کے بارے میں اخباروں میں چھپتے ۔ وہ اندوہ ناک اندھیرا اور علم و ہنر کی اس چمکدار دنیا سے جس کا نام جرمنی تھا، پھیلتا ہوا سارے یورپ پر اپنی ڈراؤنی پرچھائیں ڈال رہا تھا اور سکون کو مٹا رہا تھا۔ صرف ایک طاقت اس بربریت کا مقابلہ کر سکتی تھی اور وہ تھی کارخانوں کے مزدوروں کی تنظیم طاقت، اس جماعت کی طاقت جو اکٹھا ہو کر کام کرنے سے مسلسل طبقاتی جدوجہد کا تجربہ حاصل کر کے ایک ایسا انقلابی جماعتی شعور پیدا کرتی جا رہی تھی جو اسے سماج کو پیچھے گھسیٹنے والی سرمایہ داری کو شکست دینے اور مستقبل کی معاشرت کی تعمیر کرنے کا بدرجہ اتم اہل بناتی۔''[1]

محولہ اقتباس میں جن احوال اور ان کے سدباب کا ذکر کیا گیا ہے آگے چل کر ان کے اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں ہندوستان بھی ان اثرات سے الگ نہیں رہ سکتا تھا۔ ہندوستان کی حالت اور بھی دگرگوں تھی۔ ایک طرف انگریز حکمراں طبقے کے مظالم تھے تو دوسری جانب دیسی زمیندار اور سرمایہ دار ظلم کے پہاڑ توڑ رہے تھے اس صورتحال میں ترقی پسندوں کی مساعی کا اثر ہونا ہی تھا۔

لندن میں انجمن کا تیار کیا ہوا مینی فیسٹو جب ۱۹۳۶ء میں ہندوستان پہنچا تو یہاں بھی اس کے Followers سرگرم ہو گئے۔ گزشتہ سطور میں یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ روس میں ہی تحریک کے اثرات جہاں

---

[1] ''گفتگو'' ترقی پسند نمبر (سجاد ظہیر، یادیں)۔ بمبئی۔ ۱۹۸۰ء صفحہ۔ ۷۸

پوری دنیا پر پڑے وہیں ہندوستان بھی اس سے اچھوتا نہیں رہا۔ ہندوستان میں مزدوروں اور محنت کشوں میں اشتراکی میلان بڑھا۔ کمیونسٹ پارٹی وجود میں آئی۔ کانگریس میں بھی ایک طبقہ تھا جو اشتراکی خیالات کا حامی تھا یہاں تک کہ پنڈت جواہر لعل نہرو بھی اس کے اثر میں آئے۔ ملک کے گوشے گوشے میں مل اور کارخانے کے محنت کش اور کھیتوں میں کام کرنے والے مزدور اپنی اپنی کمیٹیاں بنانے لگے۔ اس کا ایک مثبت نتیجہ یہ سامنے آیا کہ ظلم اور استحصال کے خلاف دنیا بھر کے (بشمول ہندوستان) مزدور ایک ہو گئے۔ اور آپسی تعاون اور اتحاد کے جذبے کے تحت اشتراکیت کو فروغ دینے لگے۔ معروف شاعر اور ناقد خلیل الرحمٰن نے اپنی کتاب ''اردو میں ترقی ادب ادبی تحریک'' میں ہندوستان میں اس تحریک کے پھیلاؤ اور دورس نتائج کو واضح کرتے ہوئے ہندوستانی عوام کے رجحان اور مزاج کی بابت اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''ہندوستان میں ف قومی بیداری کی جو لہر اٹھی تھی اس میں اگر چہ بنیادی طور پر یہاں کے سیاسی و اقتصادی حالات اور برطانوی سرمایہ داری کی سخت گیریوں کو دخل تھا لیکن قومیت کا جدید تصور کے ساتھ ہی بین الاقومی مسائل کا شعور بھی آہستہ آہستہ ابھر رہا تھا.....
>
> .....کانگریس میں جو ابتدا میں ایک اصلاحی جماعت تھی اور حکومت سے پر امن تعاون کی بنیاد پر قائم ہوئی تھی اس کے اندر بیسیویں

صدی کے آغاز میں ایک نئی بیداری کی لہر دوڑ گئی۔ جب ۱۹۰۵ء کے روسی انقلاب سے ساری دنیا میں عوامی تحریکوں کا دھارا پھوٹ پڑا اور ایشیا کے محکوم ممالک اپنی گہری نیند سے چونک اٹھے۔ پھر ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس کے اثرات اور ہنگامہ بلقان میں ہندوستانیوں کا ترکی سے تعاون اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ ہندوستانیوں کو احساس ہو گیا تھا کہ اب سیاسی و سماجی مسائل کی سطح ملکی اور علاقائی حدود سے نکل کر ایک وسیع تر سرحد میں داخل ہو رہی تھی۔''[1]

درج بالا اقتباس میں خلیل الرحمٰن اعظمی نے جن بین الاقوامی حالات ومحرکات کا ذکر کیا ہے دراصل وہی حالات ومحرکات ہندوستان میں اس تحریک کی قبولیت کا باعث ہے۔ ہندوستانی ترقی پسند مصنفین کے منشور کو ملک کے مختلف گوشوں اوزبانوں کے ادباء شعراء کو ارسال کیے گئے، ساتھ ہی اس منشور کے تعلق سے ان کی آراء بھی طلب کی گئیں تا کہ انجمن کے قیام کی بابت کوئی حتمی قدم اٹھایا جا سکے۔ اس منشور کے جواب میں تمام ادباء اور دانشوروں کے مثبت جوابات آئے۔ پریم چند نے اس کی پرزور حمایت کی۔ پریم چند کے علاوہ درجنوں معروف ادیبوں اور دانش وروں نے اس کے قیام کو از حد لازمی قرار دیا۔ دانش وروں کی آراء کے مطابق اس انجمن کے ذریعے نہ صرف ادب بلکہ معاشرے میں بھی انقلاب آئے گا اور

---

[1] اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک۔ خلیل الرحمٰن اعظمی۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علیگڑھ ۱۹۹۹ء ص۔ ۱۵۶

یہ انقلاب نئے دور کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ ہندوستان میں تقسیم کے گئے منشور کو جن ادیبوں، دانشوروں کو بھیجا گیا ان میں ملک رام آنند، جیوتی گھوش، محمود دین تاثیر، ڈاکٹر ایس۔ کے سنہا اور کے ایس بھٹ وغیرہ شامل تھے۔ ان تمام اشخاص نے انجمن کے منشور اور اس کے قیام کو سراہا۔ اور اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر محمد اشرف، ڈاکٹر محمود الظفر، ڈاکٹر رشید جہاں، احمد علی ہیرین مکھر جی۔ سہیل عظیم آبادی، اختر اورینوی، سبط حسن، یوسف حسین خاں، مسٹر ہٹی سنگھ وغیرہ نے بھی اس تحریک اور اس کے اغراض و مقاصد کا خیر مقدم کیا اور عملی و تحریری طور پر اس پر کاربند ہونے کا بھی اعلان کیا۔ یہاں ترقی پسند ادیبوں کا منشور ملاحظہ کریں تا کہ ان کے ذہنی رویے اور لائحہ عمل کی بابت واقفیت ہو سکے:

> ''ہندوستانی سماج میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ پرانے خیالات اور معتقدات کی جڑیں ہلتی جا رہی ہیں اور ایک نیا سماج جنم لے رہا ہے۔ ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں ہونے والے تغیرات کو الفاظ اور ہیئت کا لباس دیں اور ملک کو تعمیر و ترقی کے راستے پر لگانے میں مدد و معاون ہوں۔ ہندوستانی ادب قدیم تہذیب کی تباہی کے بعد زندگی کی حقیقتوں سے بھاگ کر رہبانیت اور بھگتی کی پناہ میں جا چھپا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ بے روح اور بے اثر ہو گیا ہے۔ ہیئت میں بھی اور معنی میں بھی۔ اور آج ہمارے ادب میں بھگتی اور ترک دنیا کی بھرمار ہو گئی ہے۔ جذبات کی نمائش

عام ہے۔عقل وفکر کو یکسر نظر انداز بلکہ رد کر دیا ہے۔پچھلی دو صدیوں میں بیشتر اسی طرح کے ادب کی تخلیق عمل میں آئی ہے جو ہماری تاریخ کا انحطاطی دور ہے اس انجمن کا مقصد یہ ہے کہ اپنے ادب اور دوسرے فنون کو پجاریوں اور پنڈتوں اور دوسرے قدامت پرستوں کے اجارے سے نکال کر عوام کے قریب تر لایا جائے۔انہیں زندگی اور واقعیت کا آئینہ دار بنایا جائے جس سے ہم اپنا مستقبل روشن کر سکیں ہم ہندوستان کی تہذیبی روایات کا تحفظ کرتے ہو ئے اپنے ملک کے انحطاطی پہلوؤں پر بڑی بے رحمی سے تبصرہ کریں گے جن سے ہم اپنی منزل تک پہنچ سکیں۔ہمارا عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے نئے ادب کو ہماری موجودہ زندگی کی بنیادی حقیقتوں کا احترام کرنا چاہئے اور وہ ہماری روٹی کی بدحالی، ہماری پستی کا اور سیاسی غلامی کا سوال ہم اسی وقت ان مسائل کو سمجھ سکیں گے اور ہم میں انقلابی روح بیدار ہوگی۔وہ سب کچھ جو ہم میں انتشار، نفاق اور اندھی تقلید کی طرف لے جاتا ہے۔قدامت پسندی ہے اور وہ سب کچھ جو ہم میں تنقیدی صلاحیت پیدا کرتا ہے جو ہمیں اپنی عزیز روایات کو بھی عقل وادراک کی کسوٹی پر پرکھنے کے لیے اکساتا ہے۔جو ہمیں صحت مند بناتا ہے اور ہم میں اتحاد اور یک جہتی کی قوت پیدا کرتا ہے۔اسی کو ہم ترقی پسند کہتے

ہیں۔ان مقاصد کو سامنے رکھ کر انجمن نے مندرجہ ذیل تجاویز پاس کی ہیں:

۱۔ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں ادیبوں کی انجمنیں قائم کرنا۔ان انجمنون کی درمیان اجتماعوں اور پمفلٹوں وغیرہ کے ذریعہ ربط وتعاون پیدا کرنا، مرکز کی اور لندن کی انجمنوں کے درمیان قریبی تعلق قائم کرنا۔

۲۔ ان ادبی جماعتوں سے میل جول پیدا کرنا جو اس انجمن کے مقاصد کے خلاف نہ ہوں۔

۳۔ ترقی پسند ادب کی تخلیق اور ترجمہ کرنا جو صحت مند اور توانا ہو۔جس سے ہم تہذیبی پسماندگی کو مٹا سکیں اور ہندوستانی آزادی اور سماجی ترقی کی طرف بڑھ سکیں۔

۴۔ ہندستان کو قومی زبان اور انڈورومن رسم الخط کو قومی رسم الخط تسلیم کرنے کا پرچار کرنا۔

۵۔ فکر و نظر اور اظہار خیال کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا۔

۶۔ ادیبوں کے مفاد کی حفاظت کرنا۔عوامی ادیبوں کی مدد کرنا جو اپنی کتابیں طبع کرانے کے لیے امداد چاہتے ہیں۔''[۱]

۱۔ بحوالہ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک۔خلیل الرحمٰن اعظمی۔ایجوکیشنل بک ہاؤس علیگڑھ۔۹۶۔ص۔۳۲

مندرجہ بالا منشور اور اس کے تجاویز کا نہ صرف ہندوستان بلکہ لندن میں مقیم نئے قلم کاروں نے بھی بڑے پیمانے پر خیر مقدم کیا۔ اور جب تک وہ نئے قلم کار ہندستان آتے تب تک ہندستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل کا راستہ ہموار ہو چکا تھا۔ اس سلسلے میں سجاد ظہیر کی کوششیں نا قابل فراموش ہیں۔ انہوں نے ملک بھر میں دورے کئے۔ مختلف شہروں میں فعال اور سرگرم ادبا اور دانش وروں سے ملاقاتیں کیں اور سب سے پہلے الہ آباد میں اس انجمن کی بنیاد ڈالی گئی۔ یہاں صرف اردو ہی نہیں ہندی کے ادبا بھی ساتھ ساتھ تھے۔ سبط حسن نے حیدر آباد میں ماحول بنایا۔ بعد میں اس کی شاخیں لکھنو اور دیگر چھوٹے بڑے شہروں میں قائم ہوئیں۔ اس انجمن کی پہلی باضابطہ کانفرنس لکھنو میں منعقد ہوئی۔ اختر حسین رائے پوری قبل سے ہی ترقی پسند فکر کے حامی تھے لہٰذا انہوں نے سجاد ظہیر کے مرتب کردہ منشور سے ملتا جلتا ایک علاحدہ منشور ترتیب دیا اور مذکورہ کانفرنس میں پیش کیا۔ ملاحظہ کریں:

> ''ہمارے دیش میں یہ پہلا موقع ہے کہ مختلف زبانوں کے ادیب باہمی تعاون کی غرض سے ایک جگہ جمع ہوئے ہیں سوال یہ ہے کہ اس تعاون کی بنیاد کیا ہو۔ کئی تجویزیں اس جلسے میں پیش ہوئی ہیں۔ لیکن ایک اہم مسئلہ نظر انداز کر دیا گیا۔ جس پر سب سے پہلے غور ہونا چاہئے تھا۔ ہم نے تو یہ طے کر لیا کہ ادب کا قالب کیا ہوگا مگر یہ نہیں بتایا کہ اس کے قالب کا رنگ روپ کیا ہو۔ پہلے تو یہ دیکھنا ہے کہ کیا کہنا ہے اور کن سے کہنا ہے۔ کیسے

کہنا ہے کا سوال بعد میں پیدا ہوتا ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ ادب کے مسائل کو زندگی کے دوسرے مسائل سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ کاروان حیات کا رہبر ہے۔ اسے محض زندگی کی ہم رکابی ہی نہیں کرنا ہے بلکہ اس کی رہنمائی بھی کرنا ہے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ ہماری زندگی کدھر جا رہی ہے۔ اور اسے کدھر جانا ہے۔ ادیب انسان بھی ہوتا ہے اور اسے سماج کی ترقی کیلئے اتنا تو کرنا ہی ہے۔ جو ہر انسان کا فرض ہے۔ انسانیت کے نام پر ہم پوچھتے ہیں کہ کیا آج جب ترقی و پستی کی طاقتوں میں فیصلہ کن جنگ شروع ہو چکی ہے۔ ادب اپنے کو غیر جانب دار رکھ سکتا ہے؟ کیا حسن، آرٹ وغیرہ کی نقاب پہن کر راز حیات سے راہ فرار اختیار کر سکتا ہے؟ کیا واقعہ نگاری کی فصیل پر بیٹھ کر انقلاب و رجعت کی طاقتوں کی تصویر لے سکتا ہے؟

احساس ہر قسم کے آرٹ کی جان ہے تو پھر غریبوں اور مظلوموں کا حال زار ہمیں بے حس کیوں کر رکھ سکتا ہے؟ اگر زندگی کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ سماج کے چہرے سے بے کاری، افلاس اور ظلم کے داغ دھوئے

جائیں تو حاشا یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ ادب کا اشارہ کس جانب ہو۔ وہ کیا کہے؟ کن سے کہے اور کس طریقے سے کہے۔

چنانچہ ہندستانی ادیبوں سے ہماری توقع واجب اور جائز ہے کہ وہ یہ ثابت کر دکھائیں کہ ادب کی بنیادیں زندگی میں پیوست ہیں اور زندگی مسلسل تغیر و تبدل کی کہانی ہے۔ زندہ اور صادق ادب وہی ہے جو سماج کو بدلنا چاہتا ہے۔ اسے عروج کی راہ دکھاتا ہے۔ اور جملہ بنی نوع انسان کی خدمت کی آرزو رکھتا ہے ہمیں یقین ہے کہ ہمارے ملک کا ادب زندگی سے اپنے کو زندگی سے وابستہ کرے گا اور زندگی کے ارتقا کا علمبردار ہوگا۔''[1]

اختر حسین رائے پوری کے مندرجہ بالا بیان انجمن کے باضابطہ منشور کی نفی نہیں کرتا بلکہ اس منشور کو اور وسیع تر معنوں میں لیتا ہے۔ اس منشور کی تائید میں بڑی بڑی ادبی اور سماجی شخصیات نے ہامی بھری۔ ترقی پسند مصنفین کے نظریے کے ان حامیوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ ہمارا فرض ہے کہ ہم نہاں خانوں سے باہر نکلیں اور اجتماعی مفاد اور تہذیب و ثقافت کی اعلیٰ اقدار کی خاطر رجعت پسند قوتوں سے جنگ کریں اور اپنے ادب پاروں کو انسانی بالخصوص مستحصل طبقوں کی خدمت کیلئے وقف کر دیں۔ ان خیالات کو پریم چند انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی ہی کانفرنس میں پیش کر چکے تھے۔ اور ساتھ ہی تائید بھی

---

[1] ادب اور انقلاب۔ اختر حسین رائے پوری۔ ادارہ اشاعت اردو حیدر آباد۔ ۱۹۴۳ء۔ ص۔ ۱۲

کر چکے تھے۔ پریم چند نے اپنے تاریخی صدارتی خطبے میں یہ واضح کر دیا تھا کہ حالات کے پیش نظر اب ادب کو بھی تغیر و تبدل کے مرحلوں سے گزرنا ہوگا۔ پریم چند کے مطابق:

''اب حسن کا معیار بدلنا ہوگا۔ ابھی تک اس کا معیار امیرانہ رہا ہے ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں ہنگامہ، حرکت اور بے چینی پیدا کرے۔ سلائے نہیں کیونکہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔''[1]

پریم چند کے اس خطبے کا اثر ظاہر ہے بڑے پیمانے پر ہوا۔ سجاد ظہیر اور اختر حسین رائے پوری کی کوششیں رنگ لا رہی تھیں۔ آگے چل کر اس کارواں میں احمد علی بھی شامل ہو گئے اور پھر محمود الظفر اور ڈاکٹر رشید جہاں بھی میدان میں اتر آئے۔

پریم چند نے اپنے مذکورہ خطبے میں تعمیری، بامعنی اور افادی ادب کی راہ سجھائی۔ زندگی کی تلخ سچائیوں کو اجاگر کیا۔ حسن آزادی اور اخوت و بھائی چارہ پر زور دیا اور ایسے ادب کو رد کیا جو حقائق سے دور ہو۔ پریم چند نے اپنے خطبے میں انجمن کی تحریک کو سراہا اور اسے نئی سمت دینے کی کوشش کی۔ ساتھ ہی انہوں نے اپنے نظریات و خیالات کو بھی پیش کیا جو اس تحریک کے اصل مقاصد کو اجاگر اور موثر بنانے میں معاون

---

[1] نیا ادب۔ جنوری فروری۔ ۱۹۴۱ء

ثابت ہوئے۔ انجمن کی پہلی نشست میں پریم چند کے خطاب کے بعد سجاد ظہیر نے انجمن کی تنظیم وترتیب اور لائحہ عمل کی ایک روداد شائع کی اس کے بعد احمد علی، محمود الظفر اور فراق گورکھپوری نے اپنے مضامین پیش کیے۔ مولانا حسرت موہانی اور کملا دیوی چٹوپادھیائے نے اپنی تقریروں کے ذریعے اس پر بھرپور روشنی ڈالی۔ ان ادیبوں کی کوششوں کی ستائش کرتے ہوئے بلبل ہند سروجنی نائیڈو نے خط لکھا جو کافی حوصلہ افزا ثابت ہوا۔

دیگر مقالہ نگاروں میں احمد علی بھی تھے۔ انہوں نے انجمن کی سرگرمیوں اور تحریک کے نظریات پر روشنی ڈالتے ہوئے مضمون تحریر کیا۔ اس مضمون میں رجعت پسند ادبا شعرا کو ہدف بنایا گیا تھا۔ فراق گورکھپوری نے اپنے مضمون میں ہندستان کی تہذیبی اور تمدنی صورت حال کا جائزہ پیش کیا ساتھ ہی یہ واضح کیا کہ ہندستان کی دیگر زبانوں میں نئے ادبی خیالات ونظریات تحریک کے ہی مرہون منت ہیں۔ اور یہ تحریک ہمارے ملک کو نیا رخ دینے میں سب سے زیادہ اہم رول ادا کرے گی۔ اس موقع سے محمود الظفر اور دوسرے کئی صوبوں کے مندوبین کے بھی اس ضمن میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کانفرنس میں مولانا حسرت موہانی کی تقریر یادگار تھی حسرت موہانی نے اپنی تقریر میں انجمن کے اغراض ومقاصد اور اس کے منشور سے کلیتًا اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ:

''ہمارے ادب کو قومی آزادی کی تحریک کی ترجمانی کرنی چاہئے۔

اسے سامراجیوں اور ظلم کرنے والے امیروں کی مخالفت کرنا چاہئے۔ اسے

مزدوروں اور کسانوں اور تمام مظلوم انسانوں کی طرف داری اور حمایت کرنا چاہئے۔ اس میں عوام کے دکھ سکھ، ان کی بہترین خواہشوں اور تمناؤں کا اظہار اس طرح کرنا چاہئے جس سے ان کی انقلابی قوت میں اضافہ ہو اور وہ متحد و منظّم ہو کر اپنی جدوجہد کو کامیاب بنا سکیں۔..... محض ترقی پسندی کافی نہیں۔ جدید ادب کو سوشلزم اور کمیونزم کی بھی تلقین کرنی چاہئے۔ اسے انقلابی ہونا چاہئے۔ اسلام اور کمیونزم میں کوئی تضاد نہیں۔ اسلام کا جمہوری نصب العین کا متقاضی ہے کہ ساری دنیا میں مسلمان اشتراکی نظام قائم کرنے کی کوشش کریں چونکہ موجودہ دور میں زندگی کی سب سے بڑی ضرورت یہی ہے۔ اسی لئے ترقی پسند ادیبوں کو انہیں خیالات کی ترویج کرنا چاہئے۔ آپ کو زندگی کے زیادہ اہم اور سنجیدہ مسائل کی طرف توجہ کرنا چاہئے۔ اور میں اس کانفرنس میں شریک ہونے کیلئے خاص طور پر اسی لئے آیا ہوں کہ آپ کے ان مقاصد کی طرف داری اور حمایت کا اعلان کروں جو آپ نے اپنے اعلان نامے میں لکھے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے ملک میں اسی قسم کے ادب کی تخلیق ہو پرانی باتوں سے کام نہیں چلے گا۔ وہ محض دل بہلانے کی چیزیں ہیں۔ شاعری کے معاملے میں آپ کو

میری تقلید کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ میں خود اس قسم کے نئے ترقی پسند ادب کی تخلیق میں آپ کی پوری مدد کروں گا۔''[1]

مذکورہ کانفرنس میں مولانا حسرت موہانی کی تقریر کا بہت ہی اثر ہوا۔ اس سے متاثر ہو کر دوسرے ادبا کے علاوہ سروجنی نائیڈو نے بھی حمایتی مراسلہ بھیجا۔ اسی کانفرنس میں ترقی پسند مصنفین کا منشور پیش کیا گیا۔ اور پھر اتفاق رائے سے اسے منظور بھی کیا گیا۔ کانفرنس کے اختتام پر اس انجمن کے عہدیداروں کا انتخاب عمل میں آیا۔ سجاد ظہیر انجمن ترقی پسند مصنفین کے ناظم اعلیٰ بنائے گئے۔ اس کے ساتھ ہی صوبائی انجمنوں کی تشکیل اور عہدیداروں کے انتخاب کی تجویز بھی پاس ہوئی۔

لکھنو میں منعقد انجمن کی اس کانفرنس نے حد درجہ کامیابی حاصل کی۔ اس کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر مخمور صدری نے تحریر کیا کہ:

''لکھنو کی انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کل ہند کانفرنس نے پورے ہندستان کے ادیبوں اور دانشوروں کو بہت تیزی سے اپنی طرف متوجہ کیا۔ ہر جگہ اس کے چرچے ہونے لگے۔ جو لوگ اس کانفرنس میں شریک ہوئے تھے اس انجمن کو مقبول بنانے کیلئے اپنے اپنے علاقوں میں کوششیں کرنے لگے۔ خاص طور پر منشی پریم چند نے اس تحریک کو مقبول بنانے کیلئے بڑھ چڑھ

---

[1] روشنائی۔ سجاد ظہیر۔ سیما پبلی کیشن دہلی۔ ۱۹۸۵۔ ص۔ ۱۱۳

کر حصہ لیا اپنے رسالہ ہنس (جولائی ۱۹۳۶) میں اپنے خطبہ صدارت کا ہندی میں ترجمہ شائع کیا اور بنارس، پٹنہ، ناگپور اور ملک کے دوسرے شہروں میں اپنے دوستوں کو خط لکھ کر اس نئی تحریک کی طرف متوجہ کیا۔ وہ جہاں جہاں کانگریس یا ہندی ساہتیہ پریشد کے جلسوں میں جاتے اس تحریک کے مقاصد سے لوگوں کو آگاہ کرتے اور انہیں اس کو تقویت پہنچانے کا مشورہ دیتے انہوں نے سجاد ظہیر کو یہ صلاح دی کہ ترقی پسند مصنفین کا ایک ترجمان ہندی میں شائع کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی انگریزی اور دیگر زبانوں میں بھی ایسے رسالوں کی اشاعت پر زور دیا۔''[1]

ترقی پسند تحریک کے بہت ہی فعال ناقد اور دانش ور اختر حسین رائے پوری جن کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے انہوں نے پریم چند اور سجاد ظہیر کے نظریات کو قبول تو کیا لیکن خود اپنے طور پر بھی اس کی مزید وضاحتیں اور تجویزات پیش کیں۔ انہوں نے دہلی میں انجمن کی شاخ قائم کی اور مولوی عبدالحق، اسرارالحق مجاز، جوش ملیح آبادی، شاہد احمد دہلوی اور ڈاکٹر عابد حسین جیسے ادبا اور دانش وروں کو اپنا ہمنوا بنایا۔ ان اشخاص نے بھی اس انجمن کے نظریات کو مستحکم کرنے میں نمایاں کردار نبھایا۔ ادھر مولانا حسرت موہانی جن کی تقریریں ہم گزشتہ سطور میں پڑھ چکے ہیں نے کانپور میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ کی بنیاد رکھی جس

---

[1] اردو میں ترقی پسند تنقید۔ ڈاکٹر مخمور صدری۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ ۲۰۰۸ء۔ ص۔ ۵۰۔۵۱

میں مختلف شہروں کے نئے پرانے قلم کار شامل ہوئے۔

معروف شاعر فیض احمد فیض گرچہ عملی طور پر انجمن کی کاگزاریوں میں شریک نہیں رہے اور نہ ہی ان کے یہاں شدت اور قطعیت آئی لیکن انہوں نے انجمن کے نظریات اور تعمیری سوچ کی تائید کی۔ ۱۹۳۷ میں امرتسر میں پنجاب کسان سبھا کا ایک جلسہ ہونے والا تھا۔ اس موقع سے فیض نے انجمن کو بھی ایک کانفرنس منعقد کی اور لوگوں تک اس کی ضرورت اور افادیت کو پہنچایا۔ اس اجلاس میں پنجابی کے رائٹرز بھی بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ بعد ازاں سجاد ظہیر اور ان کے رفقا نے علامہ اقبال سے لاہور میں جا کر ملاقات کی اور انہیں انجمن کے نظریات وخیالات سے آگاہ کیا۔ اقبال نے ان کی کوششوں کی نہ صرف تائید کی بلکہ انہوں نے ہمہ دم آگے بڑھتے رہنے کی ہدایت بھی دی۔ اس موقع پر علامہ کی مندرجہ ذیل باتیں حد درجہ اہمیت کی حامل ہیں۔ ملاحظہ کریں:

> ''تاثیر (محمد دین تاثیر) نے مجھے ترقی پسند تحریک کے متعلق ایک دو بار باتیں کی تھیں اور اس سے مجھے بڑی دلچسپی ہوئی ہے..... ممکن ہے سوشلزم کے سمجھنے میں مجھ سے غلطی ہوئی ہے..... بات یہ ہے کہ میں نے اس کے متعلق کافی پڑھا بھی نہیں ہے۔ میں نے تاثیر سے کہا تھا کہ وہ اس موضوع پر مجھے مستند کتابیں دیں۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا لیکن ابھی تک پورا نہیں کیا۔ میرا نقطہ نظر آپ جانتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مجھے ترقی پسند ادب یا سوشلزم کی

تحریک کے ساتھ ہمدردی ہے۔آپ لوگ مجھ سے ملتے رہئے۔''[1]

ظاہر ہے اس وقت بھی علامہ کی ادبی شخصیت سنگ میل کا مقام رکھتی تھی۔ان کی ہمت افزائی رنگ لائی اور ترقی پسند تحریک کی حمایت اور سرپرستی میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا۔

درج بالا سطور میں ترقی پسند تحریک کے سیاسی، سماجی اور ادبی پس منظر کو پیش کیا گیا۔ساتھ ہی اس کے قیام جواز براہ راست ربط اور تعلق دبے کچلے عوام سے تھا۔اس لئے ہر حلقے سے اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔حالانکہ معاشرے میں اصلاح اور انصاف کی فضا بنانے میں اس سے قبل بھی متعدد کوششیں ہوئیں۔سرسید، شبلی نعمانی، نذیر احمد کی تحریریں حد درجہ اصلاحی اور تعمیری تھیں۔اور یہی افکار سرسید کی علیگڑھ تحریک میں بھی شامل رہے۔لیکن ترقی پسند تحریک نے اسے باضابطہ ایک مشن کے طور پر لیا اور مزدروں اور کسانوں کو مرکز میں رکھ کر اسے سیدھا عوام الناس سے جوڑ دیا۔یہی سبب ہے کہ یہ تحریک گزشتہ تمام تحریکات اور کوششوں سے زیادہ دم دار اور مقبول ثابت ہوئی۔

بیسویں صدی میں رونما ہونے والے حادثات وواقعات نے پوری دنیا کو متاثر کیا۔تمام ممالک میں اس بات کو سنجیدگی سے لیا جانے لگا کہ کیا پرانی اقدار اور فرسودہ خیالات کو باقی رہنا چاہئے۔یا نئے ماحول میں معاشرہ کو تبدیل ہونا چاہئے۔بالآخر یہ ذہن بن گیا کہ سماج کی صحت مند تعمیر کے لئے ان تمام عناصر کو ختم کرنا چاہئے۔جو صدیوں سے ناانصافی، نابرابری اور استحصال کی بنیاد پر ٹکے ہوئے ہیں۔اس عہد

---

[1] روشنائی۔سجاد ظہیر۔سیما پبلی کیشن دہلی۔۱۹۸۵۔ص۔۷۸۔۱۷۷

میں اقبال، چکبست، جوش، اختر شیرانی اور سجاد انصاری جیسے ادبا و دانشور موجود تھے۔ اور ترقی پسند تحریک کے اغراض و مقاصد کو اپنی حمایت دے رہے تھے۔ اس عہد کی صورت حال پر اظہار خیال کرتے ہوئے معروف مارکسی نقاد پروفیسر احتشام حسین نے لکھا کہ:

''یہ تغیر پرستی جدید ترقی پسندی کی طرف ایک قدم بڑھانے میں معاون ثابت ہوئی۔ اس نے تغیرات کی رفتار تیز کردی۔ بے اطمینانی اور ذہنی انتشار کو غذا پہنچی اور مبہم طور پر منزل اور راستہ دونوں کا دھندلا نقش پیش کردیا۔ ڈاکٹر اقبال کی جرات نقد، نیاز فخ پوری کی رنگین اور نظر فریب قدامت شکنی، سلطان حیدر جوش اور سجاد حیدر یلدرم کے یہاں عشق و محبت کا کہیں کہیں صاف اور صحت بخش بیان، چکبست کی وطن پرستی اور اتحاد دوستی، اختر شیرانی کی عورت سے محبت اور اس کا فخر سے لبریز رومانی اظہار، جوش کی بغاوتیں، سجاد انصاری کی بے باک فلسفہ طرازی، ان تمام ادیبوں نے مذہب، اخلاق خانگی زندگی اور عشق و محبت سب کا جائزہ نئے سرے سے لیا۔ انہوں نے نئی نسل کی راہ سے وہ کانٹے بھی ہٹا دیئے جو حالی، آزاد، سرسید اور نذیر احمد کے بعد باقی رہ گئے تھے۔''[1]

---

[1] تنقیدی جائزے۔ پروفیسر احتشام حسین۔ ادارہ احباب پبلی کیشنز لکھنو، ۱۹۵۴ء۔ ص۔ ۳۱۔۳۰

مختصر یہ کہ مختلف اوقات میں مشاہیر شعرا و ادبا اور دانش وروں کی کوششوں اور حمایت سے یہ تحریک توانا ہوتی گئی۔ احتجاج اور بغاوت کی لے تیز ہوئی۔ اس دوران بغاوت کی ایک زور دار آواز بن کر ''انگارے'' سامنے آیا۔ اس مجموعہ افسانہ کی اشاعت نے ایک طرح سے اس تحریک کی کامیابی پر مہر ثبت کر دی۔ اظہار خیال کی آزادی بڑھی اور وہ لوگ جو کسی مصلحت، جھجک یا اپنی عادت کے مطابق ان نظریات سے کچھ دور تھے وہ بھی Direct یا Indirect ان سے قریب ہو گئے۔

اگر مختصر طور پر انجمن کے قیام کے سیاسی، سماجی اور ادبی پس منظر کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تحریک ایک مخصوص سیاسی اتھل پتھل کے عہد میں شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ پورے سماج اور معاشرے کے ہر گوشے میں پھیل گئی۔ اور چونکہ ادب معاشرہ کا آئینہ ہوتا ہے اس لئے ادب پر بھی اس تحریک کے نظریوں اور اغراض و مقاصد کے عکس پڑے۔ اس ضمن میں تحریک کے آغاز اور ارتقا اور اس کے اہم نکات کو پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر شارب ردولوی نے لکھا ہے:

> ''اگر مجموعی طور پر انجمن کے مینی فیسٹو، پریم چند کے خطبہ صدارت حسرت موہانی، دیگر دانش وروں اور رہنماؤں کی تقاریر، کانفرنسوں میں پاس کئے جانے قرار دادیں، تحریک کے آغاز سے متعلق اس کے مختلف پہلوؤں پر بحث و مباحثے، ترقی پسند نقادوں اور ادیبوں کی تنقیدی تحریروں کا مطالعہ کیا جائے تو مندرجہ ذیل پہلو سامنے آتے ہیں۔

۱۔ ادب کو سماج اور معاشرے کا ترجمان ہونا چاہئے۔

۲۔ ادب کو رجعت پسند، تنگ نظری، روایت پرستی اور ماضی پرستی کی مخالفت کرنی چاہئے۔

۳۔ ادب کو آزادی اور جمہوریت کا علمبردار ہونا چاہئے اور اسے سامراجیت اور فاشزم کی مخالفت کرنی چاہئے۔

۴۔ ادب کے مواد اور موضوعات خواص کے بجائے عوام اور ان کی زندگی کے مسائل سے اخذ کئے جانے چاہئیں۔

۵۔ ادب کو سماجی، سیاسی اور معاشی ناانصافی، استحصال، ظلم، تشدد، نفرت اور تعصب کے خلاف آواز اٹھانی چاہئے۔ اور اسے صداقت، انصاف، امن نیکی مساوات اور محبت کا دم بھرنا چاہئے۔

۶۔ اسے فرقہ پرستی کے بجائے تغیر، انفرادیت کے بجائے اجتماعیت اور رومانیت کے بجائے حقیقت کا علمبردار ہونا چاہئے۔

۷۔ ادب میں تصنع کے بجائے سادگی، ابہام ورمزیت پر وضاحت اور ہیئت مواد کو ترجیح دینا چاہئے۔

بہرحال ترقی پسند مصنفین کی تحریک اردو ادب میں ایک تاریخ ساز

تحریک کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس تحریک نے اردو ادب کو نئے موڑ سے روشناس کیا۔ اس نے پرانے ڈھانچے کو توڑ کر نئے خیالات تصورات اور حقیقتوں پر ادب کی عمارت تعمیر کی۔ جدید تنقید کو جنم دیا اور عام تنقید کی سطح کو بلند کیا۔ تنقید کو خالص جمالیاتی اور فنی دائرے سے نکال کر سماجی اور تاریخی مطالعہ پر زور دیا۔ ساتھ ہی ادبی تجربے بھی کئے۔ جو صرف مواد، موضوعات اور فکر کی سطح پر ہی نہیں بلکہ ہیئت، تکنیک اور فن کی سطح پر بھی تھے۔ اردو میں آزاد نظم کی مقبولیت اور اس میں موضوع کے تجربے ترقی پسند کی دین ہیں۔ گویا آج کے معتبر ادب کا بیشتر حصہ ترقی پسند مصنفین کی تحریک کی مرہون منت ہے۔''[1]

غرض یہ کہ اتمام حجت کے طور پر یہاں کہا جاسکتا ہے کہ اردو ادب ہو یا کسی زبان کا ادب، فی زمانہ اس میں تغیر و تبدل اور رد و قبول کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ویسے بھی بدلاؤ قدرت کا اصول ہے۔ اسی بدلاؤ اور تبدیلی سے تاریخ بدلتی ہے۔ اور نئے نئے رنگ روپ سامنے آتے رہتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک بھی ایک سماجی بدلاؤ کا نتیجہ تھی۔ عالمی سطح پر اس تبدیلی کو سجاد ظہیر اور ان کے رفقا نے جو کچھ لندن میں رہ کر دیکھا اور محسوس کیا اس کے اثرات ان کے ذہن و دل پر ثبت ہو گئے۔ وہ مغرب میں رہتے ہوئے بھی اپنے ملک

---

[1] جدید اردو تنقید: اصول و نظریات۔ ڈاکٹر شارب ردولوی۔
اتر پردیش اردو اکادمی۔ لکھنؤ۔ ۱۹۹۴ء۔ ص۔ ۶۱۔۳۶۰

سنوارنا بنانا چاہتے تھے۔ان کی دلی خواہش تھی کہ ہندستانی عوام اور فنکار بھی دنیا کے ساتھ چلیں اور وقت کا ساتھ دیتے ہوئے خود کو بھی بدلیں اور معاشرے کو بھی۔ یہی وہ جذبہ تھا جس نے اس تحریک کو ہندستان اُس ہر طبقے تک پہنچایا۔اس ضمن میں علی احمد فاطمی اس تحریک کے آغاز اور اس کے مقاصد کی بابت اظہار خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''...... یہ خیال ان کے (سجاد ظہیر) شعور میں جگہ پاچکا تھا کہ ظالم حاکم وقت سے شاعر و ادیب کس طرح لڑائی لڑ سکتے ہیں۔ معاشرے کی صحت و تعمیر میں ان کا کس طرح رول ہوسکتا ہے۔ ہندستان میں آزادی کی لڑائی پورے شباب پر تھی دیکھتے دیکھتے تنظیم نے تحریک کی شکل اختیار کر لی اور ترقی پسند تحریک بقول ظہیر کاشمیری، ''متحدہ محاذ کا پلیٹ فارم بن گئی''۔ اس میں ہر طرح کے لوگ تھے۔ مارکسسٹ بھی، ڈیموکریٹ بھی، محبّ وطن بھی، لیکن ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو سماج کو بہتر لائنوں پر چلانا چاہتے تھے۔اور سماج کی پرانی غیر استدلالی روایتوں کے خلاف جنگ لڑنا چاہتے تھے۔......اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ہندستان کے معاشرے کا جو ڈھانچہ ہے اس میں انقلابی تبدیلی آنی چاہئے۔......''[1]

---

[1] ترقی پسند تحریک۔سفر در سفر۔پروفیسر علی احمد فاطمی۔ادارہ نیا سفر الہ آباد۔ص۔۱۰

پروفیسر علی احمد فاطمی کے اس اقتباس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ تحریک کے علمبرداروں کے نزدیک سب سے اہم بات سماج اور عوام کی فلاح و بہبود تھی۔ اور اسی نظریے کے تحت ادب کو وہ آگے لے جانا چاہتے تھے۔ اور اپنے مسلسل جلسوں جلوسوں کے ذریعے ادب کا رخ موڑنے کا کام بھی انہوں نے کیا۔ انکے جذبے کی صداقت اور ان کی پر جوش عملی سرگرمیوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہاں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ادب، ادب ہوتا ہے۔ ادب کے کچھ تقاضے اور باریکیاں ہوتی ہیں اگر ان کو درگزر کر کے ادب تخلیق کیا جائے تب وہ ادب نہیں رہتا کچھ اور ہو جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ترقی پسند تحریک نے ہندستانی سیاست، معاشرہ اور ادب کو بڑے پیمانے پر متاثر کیا۔ لیکن ترقی پسند ادب کا ایک بڑا حصہ صرف پروپگنڈہ بن کر رہ گیا۔ چونکہ تحریک کا اثر ایک لمبے عرصے تک رہا اس لئے ان تمام عرصے میں ادب کا مزاج بدلا۔ روایتی ادب جو فنی برتاؤ کا متقاضی تھا وہ رفتہ رفتہ پس منظر میں جاتا ہوا محسوس ہوا۔ لیکن یہ صورت حال تادیر قائم نہ رہ سکی اور پھر زمانے نے کروٹ لی اور ادب نئے رجحان کی طرف راجع ہوا۔

☆

باب چہارم

(الف)

ترقی پسند تنقید کے اہم نظریاتی مباحث

(ب)

ترقی پسند تنقید کا عہد بہ عہد ارتقا

(الف)

ترقی پسند تنقید کے اہم نظریاتی مباحث

ترقی پسند تنقید کے نظریاتی مباحث کا اصل منبع مارکس کا تاریخی شعور اور سماجی نشو ونما ہے۔ مارکس نے اسے مادی جدلیت (Material Dialectics) کہا۔ کارل مارکس جرمنی کا ایک بڑا دماغ تھا اور ایک ساتھ سماج، اقتصادیات، تاریخ اور فلسفہ پر اس کی گہری نظر تھی۔ اسکے نظریات نے بڑے پیمانے پر معاشرہ اور معاشرتی علوم کو متاثر کیا۔ اس نے اپنے افکار کے ذریعہ جہاں معاشرے میں بدلاؤ لانے کا کام کیا وہیں ایک ایسے نظریے کی بنیاد رکھی جو بہت کم وقتوں میں یوروپی اور ایشیائی ممالک میں مقبول ہوا۔ اس نظریے کو مارکسزم کا نام دیا گیا۔ مارکسزم کے نظریے کے مطابق حقیقت کو Constent کے بدلے جدلیاتی نامیاتی متحرک اور مادی تصور کیا جاتا ہے اور تمام قدروں کو زندگی کی بنیادی ضرورتوں اور Material Dialectics کے اطراف میں طواف کرتے ہوئے تصور کیا جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ مارکسیت کے Followers جن میں دانش ور، نقاد اور ادیب سب شامل ہیں، کے مطابق زندگی کی حقیقتیں اور اقدار ہمیشہ اپنے رنگ روپ بدلتے رہتے ہیں۔ اور قدامت پرستی سے نجات حاصل کرتے رہتے ہیں۔ مارکس کا نظریہ صرف ادب کے لئے نہیں تھا۔ یہ نظریہ پوری انسانی آبادی کے لئے تھا۔ اس

کانظریہ پہلے سماج اور پھر ادب پر منطبق ہوا۔ مارکس مادی کیفیات کے تغیرات کے ساتھ سماج اور سماجی سروکار کو متحرک مانتا ہے۔ اس لئے اسکے خیال میں پیداوار، محنت کش، مزدور اور دولت کی تقسیم کے پیش نظر سماج کو کئی حصوں اور طبقوں میں تقسیم ہونا پڑتا ہے۔ اور جب آگے چل کر محنت کش اور سرمایہ دار کے آپسی رشتے آپس میں متصادم ہوتے ہیں تو دونوں کے درمیان سماجی سطح پر ایک کشمکش کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ جس کا اثر پورے دائرے میں خود بخود آجاتا ہے۔ مارکس نے اس بابت مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اپنے وجود کے ذرائع کو سماجی پیداوار میں انسان متعین کر کے ایسے ضروری رابطوں میں داخل ہوا جو اس کے شعور سے آزاد تھے۔ یہ اصل میں پیداوار کے رشتے تھے جو ایک متعینہ مدت تک ان کی مادی پیداوار کے ہیئتوں کا مجموعہ سماج کا ایک اقتصادی ڈھانچہ ابھرتا ہے اور جس سے متعین قسم کے سماجی شعور متعلق ہوتے ہیں۔ پیداوار کا طریقہ مادی وجود کے ذرائع کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اسی سے سماجی، سیاسی اور ذہنی زندگی مشروط ہوتی ہے انسان کے شعور سے اس کا وجود نہیں متعین ہوتا بلکہ اس کے مارکسی نظریے کے مطابق طریقۂ پیداوار اور تقسیم کے باہمی سروکار کے ذریعہ ہی معاشرتی شعور و ادراک کی بنیاد متعین ہوتی ہے۔ اور ادب و فن بھی سماجی

شعور کے ہی دائرے میں آتے ہیں۔ اس طرح بھی جدلیاتی مادیت اور طبقاتی کشمکش سے اچھوتے نہیں رہتے۔[1]

مارکس کے پہلے بھی شعر وادب کے سلسلے میں تاریخی اور سماجی تصورات بہت سے ادیبوں کے یہاں ملتے ہیں۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد عقیل رضوی رقم طراز ہیں:

''تنقید کے اس تاریخی شعور کی روایت بہت پرانی ہے۔ یورپ میں اسے جرمنوں نے شروع کیا۔ فرانس میں سینٹ بیو اور ٹین نے اسے اپنے طریقوں پر عام کرنے کی کوشش کی اور اردو میں یہ رجحان ترقی پسند تحریک کے ساتھ باضابطہ طور پر داخل ہوا۔ اس کی بکھری ہوئی شکلیں محمد حسین آزاد کی آب حیات میں کہیں کہیں مل جاتی ہیں۔ ترقی پسند دور سے پہلے تنقید کا یہ طریقہ شعوری طور پر عام نہیں ہوا۔ ترقی پسند تحریک نے شعر وادب میں ایک نیا رخ پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ان سماجی اور تاریخی رشتوں کو بھی تلاش کرنے کی کوشش کی۔''[2]

---

[1] بحوالہ جدید اردو تنقید۔ اصول ونظریات۔ شارب ردولوی۔ اتر پردیش اردو اکادمی۔ ۱۹۹۴۔ ص۔ ۳۴۳

[2] سماجی تنقید اور تنقیدی عمل۔ محمد عقیل رضوی۔ تہذیب نو پبلی کیشنز، الہ آباد۔ ۱۹۸۰ء۔ ص۔ ۱۰۷

محولہ اقتباس سے اندازہ ہوا کہ مارکس نے جو تاریخی اور سماجی نظریہ پیش کیا وہ بالکل نیا نہیں تھا بلکہ اس سے قبل بھی یہ نظریہ مختلف شکلوں میں موجود تھا۔ مغربی ادبیات میں تاریخی رجحان کو سب سے پہلے ہرڈر اور وائکو جیسے مفکرین نے برتا، ٹین کا ذکر آ ہی چکا ہے۔ یہاں ٹین کا نظریہ بھی ملاحظہ کرتے چلیں۔ وہ کہتا ہے کہ فن اپنے ماحول سے الگ نہیں رہ سکتا۔ اس لئے ادب اور آرٹ کی افہام و تفہیم کے لئے ہمیں اس عہد کے مخصوص ماحول اور ذہنی و معاشرتی عوامل اور محرکات پر نظر رکھنی ہوگی۔ وہ کہتا ہے کہ تمام فنکار اپنے زمانے کی پیداوار ہوتے ہیں۔ ٹین کے اس خیال سے ثابت ہوتا ہے کہ خالص ادب اور ادیب وہ ہوتا ہے جو تاریخ اور سماج کے بیچ سے اٹھتا ہے۔ اگر ادیب اس سے الگ کسی دوسرے ماحول کی بات کرتا ہے تو اس کا ادب بے معنی اور بے وقعت ہو جاتا ہے۔ ٹین کے استاد سینٹ بیو نے بھی کم و بیش یہی خیالات ظاہر کئے ہیں۔ لیکن ٹین نے اپنے افکار کو مزید وسعت دی اور ہر ادب پارہ کو اس کے مخصوص ماحول اور پس منظر کا نتیجہ قرار دیا۔ اور اس تجزیے کے لئے کئی اصول و ضوابط متعین کئے۔

مندرجہ بالا مفکرین اور مارکس میں ایک فرق یہ سامنے آیا کہ مارکس نے باضابطہ اور شعوری طور پر تاریخی رجحان کے ساتھ اس کے سماجی اور معاشی نظریے کو پیش کیا اور پہلی دفعہ جدلیاتی مادیت (Dialectical Materialism) کی اصطلاح وضع کی۔ اس نے صاف طور پر یہ واضح کیا کہ ثقافت کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب بھی جدلیاتی عمل اور Inteaction کے ذریعہ پیداوار کے رشتوں کو منسلک کرتا ہے اور ان کی اصلاح کرتا ہے۔ مخمور صدری کے مطابق:

''تاریخ کے تانے بانے اور سماجی نشو ونما کے قانون کا کارل مارکس نے جدلیاتی مادیت Dialectical Materialism نام رکھا ہے۔ یہاں جدلیات کے مفہوم کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ جدلیات کے لغوی معنی دو آدمیوں کے درمیان اس قسم کی گفتگو کے ہے جن میں تناقص اور تضاد ہو۔ اور ان کی گفتگو مناظر یا مباحثے کے درمیان کا ایسا راستہ نکل آئے جو تناقص و تضاد کا درمیانی راستہ ہو۔ مارکس کے نزدیک زندگی اور اس کے مادی تقاضے پہلے طریق پیداواری کو تبدیل کر کے آلات زر میں تغیرات پیدا کرتے ہیں۔ بعدازاں بطریق پیداوار اور آلات ہی میں مل کر معاشرت میں سماجی سیاسی اور ذہنی انقلابات لانے کا موجب بنتے ہوئے زندگی کو ارتقا کا ایک اور مرحلہ طے کراتے ہیں۔ مارکس نے انسانی شعور اور عقل کو واضح تر ارفع مقام دینے سے انکار کرتے ہوئے اس امر پر زور دیا کہ شعور انسانی زندگی اور سماجی مقام کا تعین نہیں کرتا بلکہ سماجی حیثیت اور مادی اسباب انسانی شعور، سوچ اور عقل کے انداز طے کرتے ہیں۔''[1]

جیسا کہ گزشتہ سطور میں عرض کیا گیا کہ مارکس کے نظریے کا کوئی Direct تعلق شعر و ادب یا تنقید

---

[1] اردو میں ترقی پسند تنقید۔ ڈاکٹر مخمور صدری۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ ۲۰۰۸۔ ص۔ ۲۰۰۔۱۹۹

سے نہیں تھا۔ یہ ایک ایسا نظریہ تھا جس کی پشت پر صدیوں کی جبر وظلم سے بھری تاریخ کا عکس تھا اور اسی کے ردعمل میں سماج اور سرمایہ دار طبقہ کو تبدیل کرنے کا زور تھا۔ مارکس نے اپنے نظریے کی رو سے ادب کو سماجی شعور کا ایک حصہ مانا تھا اور اقتصادی بنیاد کو معاشرے کا اٹوٹ حصہ مانا تھا۔ جو شعر وادب کی تخلیق کے دوران نہ صرف عملی کارنامہ انجام دیتے ہیں بلکہ یہ وقت بہ وقت تبدیل بھی ہوتے رہتے ہیں۔ اور یہی اسباب ہیں کہ زندگی کے سارے لوازمات زندگی کے سارے شعبے خواہ وہ ادب ہو یا فن یا اخلاقی قدریں ہوں یا تہذیبی سب بدلتے رہتے ہیں۔ اس سے قبل جیسا کہ عرض کیا گیا کہ تاریخی شعور کئی مغربی اور خود اردو کے مفکرین کے یہاں بھی تھا لیکن مارکس نے اسے باضابطگی کے ساتھ پیش کر کے پوری دنیا کو غور وفکر پر آمادہ کیا اور ساتھ ہی اپنے نظریے کی تشریح اور تبلیغ میں بھی وہ تاحیات سرگرم رہا۔ بعد میں معروف مفکر اور دانش ور اینگلز بھی مارکس کے اس نظریے کا حامی ہو گیا اور اس نے بھی جدلیاتی مادیت کی توضیح میں اچھا خاصا زور صرف کیا۔ مجنوں گورکھپوری نے جدلیاتی مادیت(Dilectical Materialism) پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''مارکس اور اینگلز کی جدلیاتی مادیت (جس کا دوسرا نام تاریخی مادیت ہے) کا اصل مبحث تو اقتصادی اور معاشرتی حدوث وارتقا ہے۔ لیکن اس سے لازمی طور پر فنکاری کا نظریہ بھی متاثر ہوتا ہے۔ مارکس کہہ چکا ہے کہ وجود شعور کو متعین کرتا ہے۔ اس کا یہ قول بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ ماحول کے ساتھ میرا

تعلق ہی میرا شعور ہے۔ انسان کے خیالات اور جذبات اس کے تمام مساعی ایک مخصوص دور کے ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں اور جو مادی اسباب کسی ایک ماحول کی تشکیل کرتے ہیں ان میں طریقہ پیداوار یا پیداوار کی غرض سے اقتصادی تنظیم سب سے زیادہ اہم ہے..... ہر تخیّلی اکتساب اپنے زمانے کے مادی دنیا کا تخلیقی عکس ہوتا ہے۔''[1]

مارکس کے ان خیالات کا پرتو آگے چل کر فلپ سڈنی، کرسٹوفر کاڈویل، لوکاچ، جارج تھامس، پیٹرک، گورکی اور ایلیک ویسٹ جیسے دانش وروں اور ادیبوں کی تنقیدی تحریروں پر دکھائی دیتا ہے۔ اس میں اینگلز، اور لینن کی حمایتیں، بھی اکثر تنقیدات میں عکس ریز ہوتی ہیں۔ مارکس کے نظریات وسیع پیمانے پر عام کرنے کیلئے مشہور زمانہ ناقد پیلی محنوف نے ایک کتاب ''فن اور سماجی زندگی (Art and social life) لکھی۔ اس کے مطابق کوئی بھی ادیب اپنے معاشرے اور اطراف سے اچھوتا نہیں رہ سکتا۔ اسکے مطابق:

''ہمدردی کا ایک رشتہ سماج کے ایک طبقے اور ان لوگوں میں جو فنی تخلیقات میں دلچسپی لیتے ہیں۔ یقیناً ہوتا ہے۔ فن برائے فن کا نظریہ اس گنجلک اور مبہم تصور کی پیداوار ہے جب ایک مایوس کن تضاد فنکار اور اس

---

[1] ادب اور زندگی۔ مجنوں گورکھپوری۔ اردو گھر۔ علیگڑھ۔ ۱۹۶۴ء ص۔ ۵۶۔ ۱۵۵

کے سماجی ماحول کے درمیان پیدا ہو جاتا ہے۔''[1]

مذکورہ نقاد کے علاوہ مارکس کے نظریاتی مباحث کو آگے بڑھانے میں رالف فاکس پر بوریت اور فلپ ہنڈرسن نے بھی نمایاں رول انجام دیا ہے۔ یہ تمام مغربی ناقدین ادب، زندگی اور سماج کو ایک ہی زمرے کی شے ثابت کرتے ہیں۔ وہ ادب کی افہام و تفہیم کے لئے مادی کیفیت، سماجی شعور اور Class Clash کو از حد لازمی سمجھتے ہیں۔ ان ناقدین میں رالف فاکس کا یہ خلاصہ ملاحظہ کریں:

''تخیل کی ہر پیداوار اس واقعی دنیا کا عکس ہوتی ہے جس میں صاحب تخیل زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس لئے ادب بھی اس تعلق کا نتیجہ ہے جو ادیب کو اپنے زمانے کے ساتھ اور اس دنیا کو اس ادیب کے ساتھ ہوتا ہے۔''[2]

مارکس کے نظریات کی تائید میں ایلیک ولیٹ کی تصنیف Crisis and Criticism بھی بہت اہم ہے۔ اس میں مصنف نے تنقید کو ایک رجائی مارکسی نقطہ نظر سے پیش کیا ہے۔ اسی سلسلے کا ایک اہم ناقد لوکاچ بھی ہے۔ اس نے مارکسی افکار و نظریات کا تتبع کرتے ہوئے جمالیاتی و فنی عناصر کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ اس کا طریقہ اظہار سائنسی زیادہ ہے۔

مارکس اور لینن نے اپنے نظریات کو منطقی اور سائنسی سطح پر جس طرح فروغ دیا اس کی مثال کم ہی ملتی

---

[1] جدید اردو تنقید اصول و نظریات۔ شارب ردولوی۔ ص۔ ۱۳

[2] بحوالہ ادب اور زندگی۔ مجنوں گورکھپوری۔ ص۔ ۲۱۹

ہے۔ مارکس اورلینن کے افکار ونظریات نے اولاً سائنسی تعریف کو وسیلہ بناتے ہوئے علم کے جوہر کی وضاحت کی اورانسانی وقوف اور منطقی سچائی کے حصول سے متعلق سرگرمیوں کے خصائص، اس کی نوعیت اورحدود کو ظاہر کیا۔انہوں نے یہ بات بھی تسلیم کروالی ہے کہ انسان کے ذہن میں مادی ماحول کے وقوعات اور خارجی عوامل کا عکس ہی وقوف کی بنیاد ڈالتا ہے۔ اور اسی سے آدمی کے اندر ساری خوبیاں اورسماجی طریق کار کا وصف قائم ہوتا ہے۔

مارکس اوراس کے ہم خیال ناقدین اور دانشوروں کی یہ کوششیں اپنے عہد میں بالکل منفرد اورممتاز تھیں۔ انہوں نے تمام روایتی اور قدیم بندشوں اورنظریات کی نفی کرتے ہوئے انسان، ان کے ذہن، اس کی ذہنی حالت اوراس سے حاصل ہونے والے ادراک اورشعورکو ہی اصل اور بامعنی شے ثابت کیا۔ ظاہر ہے یہ انکار بہت ہی علاحدہ اور چونکا دینے والے تھے۔ مارکس کےنظریات نے ایک طرح سے پہلے سے موجودتمام عمارتوں کومندہم کردیا۔ اورفکر کی ایک دنیا کو سامنے کردیا۔ اس کے دوررس اور بامعنی نظریے پر ہرحلقے میں مباحثہ قائم ہوا۔ اختلافات اور اعراضات بھی ہوئے لیکن اس سے انکارنہیں کیا جاسکتا ہے کہ یہ ایک انقلاب تھا۔اوراس نے اپنادیرپا اثرادب اورسماج دونوں پر یکساں چھوڑا۔

کمیونسٹ پارٹی کے منشور میں اس بات پر زوردیا گیا کہ ان کا (یعنی اس نظریے کے حامیوں کا) مقصداورکاز اسی وقت مکمل ہوگا جب سرمایہ داراور حکام طبقات کی پسپائی ہوگی۔کمیونسٹ پارٹی کے اعلان نامے نے بہت کم وقت میں ادب اورتنقید کے معیار اور رخ کو یکسر بدل کررکھ دیا۔ ماضی کی داستان

دہرانے کے بدلے اطراف وجوانب میں موجود تمام مادی اسباب کو پیش نظر رکھا گیا۔ یہاں ایک طرح ترقی پسند ادب اور تنقید کی شعریات طے پائی اور اس شعریات کی رو سے مادہ ہی زندگی کی اٹل اور اصل سچائی ہے۔ چونکہ مادہ متحرک ہوتا ہے اس لئے تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن مارکس نے اپنے نظریے میں یہ بھی واضح کر دیا کہ مادہ بہت کچھ تو ضرور ہے لیکن انسان کو بہر حال اولیت حاصل ہے۔

اس ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر رقم طراز ہیں:

''.....لیکن مادہ کی اولیت کا یہ مطلب نہیں کہ یہ انسانی شعور سے یکسر لاتعلق رہتا ہے۔ مارکس کے خیال میں ایسا نہیں بلکہ مادہ اور شعور کے درمیان باہم اثر پذیری اور عمل و ردعمل کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ مادی حالات انسانی ذہن اور شعور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جواب میں انسان ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے یا تو ان حالات کی تسخیر کرتا ہے یا پھر مزاحمت (ورنہ مفاہمت) کی راہیں تلاش کرتا ہے۔ اگر ایسا نہ کرے تو وہ خود مسخر ہو جائے۔ خارجی حالات انسانی شعور کو متاثر کرتے ہیں اور پھر شعور اور انسانی ذہن ردعمل میں خارجی حالات پر اثر انداز ہو کر انہیں بدلنے اور بہتر بنانے کی سعی کرتے ہیں۔ ایک حالت میں اپنی انتہا کی شکل شکار ہو جاتی ہے۔ یعنی اپنی نفی اور تردید کا سامان بہم پہنچا کر اس حالت کو جنم دہی کی

موجب بنتی ہے جو پہلی حالت کے تمام منفی اثرات سے پاک ہوتی ہے۔ کچھ عرصہ بعد یہ نئی حالت جب معاشرہ کی ترقی پذیری کا ساتھ دینے میں ناکام رہتی ہے تو معاشرے کے بدلتے ہوئے رجحانات کے تحت اسکے بھی منفی خصائص نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ تو ایک اور نئی زیادہ بہتر زیادہ صحتمند اور مکمل حالت اسکی جگہ لے لیتی ہے۔ یہ حالت اپنی انتہا تک پہنچ کر پھر ایک اور مزید بہتر حالت کی جنم دہی کا باعث بنتی ہے۔ الغرض اسی طرح منفی سے مثبت، مثبت سے منفی اور پھر منفی سے مثبت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔''[1]

محولہ بالا اقتباس کی روشنی میں ڈاکٹر سلیم اختر اسی منفی اور مثبت یعنی تاریکی اور روشنی کے درمیان معاشرے کو تبدیل ہوتے اور ہمہ دم ارتقا کرتے ہوئے محسوس کرتے ہیں۔ ساتھ ہی اسی فطری اور قدرتی عمل کو وہ مادی جدلیت Material Dialectism کی مناسب تعریف اور تفہیم تصور کرتے ہیں۔ مادی جدلیت کا نظریہ جب ہر وقت ذہن میں ہوتا ہے تو کوئی بھی ادب پارہ تخیل اور تصور کی مصنوعی دنیا میں ایک پل نہیں ٹکتا بلکہ یہ عام انسان کی زندگی، اسکے سماجی احوال و عوامل سے بالکل قریب ہو جاتا ہے۔ اس لئے باوجود اعتراضات کے اگر ہم ترقی پسند تنقید جس کو ہم مارکسی تنقید بھی (کئی معنوں میں) کہہ سکتے ہیں

---

[1] تنقیدی دبستان۔ ڈاکٹر سلیم اختر۔ عفیف آفسٹ پرنٹرس دہلی۔ ۲۰۰۹۔ ص۔ ۱۷۶۔۱۷۷

اس کے مطابق ادب برائے ادب کا نظریہ صرف شور وشغب اور تبلیغ نظریہ نہیں بلکہ یہ عام آدمی کی زندگی سے مطابقت بھی رکھتا ہے۔ یہ طرز تنقید صدیوں سے آرہے مظالم اور سماجی ناانصافی پر ایک تازیانہ بھی ہے۔اس لئے فی زمانہ اس کی افادیت سے یکسر انکار نہیں کیا جاسکتا۔ادب میں زندگی کی ترجمانی اور حقیقی صورت حال کی عکاسی پر جس طرح اس تنقید نے پوری سرگرمی سے صدا بلند کی،اس کی نظیر قبل کی پوری ادبی تاریخ میں نہیں ملتی۔ مارکسی یا ترقی پسند ناقدین نے ادیبوں کے کردار اور انکے نصب العین کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ انہیں عوام اور مقہور ومغضوب لوگوں کا حامی اور محافظ ہونا چاہئے۔اسے ماضی کے مریضانہ اطوار کو چھوڑ کر حال کے تلخ حقائق کے روبرو ہونا چاہئے اس تنقید نے یہ بھی واضح کیا کہ ادیب کو عام انسانوں کا ہمدرد ہونا چاہئے۔اس تنقید نے یہ بھی واضح کیا کہ ادیب کو عام انسانوں کا ہمدرد ہونا چاہئے اور اسکے ادب کو مزدوروں اور محنت کشوں کا ترجمان اور حامی ہونا چاہئے۔ نیز یہ کہ معاشرے میں ادیب کا مقصد اور نصب العین یہی ہونا چاہئے کہ وہ عام لوگوں کا ہر وقت خیال رکھے۔

اس کی توجیہہ بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر نے فرمایا ہے:

> ''مارکس کی تعلیمات کی رو سے کیونکہ معاشرہ کا ارتقاء اور زندگی کے دیگر مظاہر مادی احتیاجات اور اقتصادی عوامل کے مرہون منت قرار پاتے ہیں اس لئے جب ان نظریات کا ادیب پر اطلاق کیا گیا تو ادب اور اس کے ساتھ ساتھ دیگر فنون لطیفہ کے آغاز کا سراغ بھی معاشی تقاضوں اور آلات

پیداوار کی صورت میں تلاش کیا گیا۔ جرمن ماہر معاشیات کارل بیوشر، روسی نقاد پیلی سخوف اور انگریز نقاد جارج ٹامس۔ ان سبھی نے مکانی اور زمانی بعد کے باوجود بھی اس خیال کا اظہار کیا کہ کام کرتے وقت منھ سے نکلنے والی آوازیں تناسب کے سانچے میں ڈھلیں تو آہنگ نے جنم لے کر غنائی شاعری اور ترنم کی تشکیل کی جبکہ محنت کرتے وقت جسم کی مختلف النوع حرکات نے فن کارانہ حسن سے ترتیب پا کر رقص اور اس کی مختلف کیفیات کی تخلیق کی۔ اس انداز نظر کی رو سے آلات موسیقی کی اصل آلات کشاورزی اور اوزاروں میں تلاش کی جاسکتی ہے۔ ونٹ (Wanut) نے بھی ایسے ہی خیال کا اظہار کیا کہ قدیم معبدوں یا وحشی معاشرے میں رقص کے ساتھ گائے جانے والے نغمات اور مناجات کے آہنگ کا ماخذ بھی مختلف کاموں سے وابستہ مخصوص گیتوں کے آہنگ میں تلاش کیا جاسکتا ہے..... کرسٹوفر کاڈویل اور پیلسخوف اس نظریے کے حامی ہیں کہ شاعری رقص، موسیقی اور بعض سازوں کا ابتدائی انسانی معاشرہ میں آغاز جمالیاتی ذوق کی تسکین کے برعکس کھیتی باڑی اور محنت، مشقت کے باعث تھا۔''[1]

---

[1] تنقیدی دبستان۔ ڈاکٹر سلیم اختر۔ عفیف آفسٹ پرنٹرس۔ نئی دہلی۔ ۲۰۰۹۔ ص۔ ۸۸۔ ۱۸۷

مارکسی تنقید جو ایک طرح سے ترقی پسند تنقید کی بنیاد ہے اس نے تمام مروجہ رویے اور کلیے کو بدلنے کیلئے جس طرح انسان، معاشرہ اور تبدیلی کے فطری مراحل کی تشریح وتعبیر کی، اس کی مثال کسی دوسری تنقید میں شاید ہی ملے۔ مارکسی تنقید کی حمایت میں اس عہد اور اسکے بعد کے زمانوں میں مباحث کا سلسلہ جاری رہا۔ کچھ اعتراضات کے پہلو بھی سامنے آئے۔ لیکن اس کے افادی نکات کو نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا۔ ادب کی تخلیق کا نصب العین اور اس کے بنیادی مقاصد پر قبل میں بھی بحثیں ہوتی رہی ہیں۔ ارسطو سے لے کر بعد کے مشاہیر میں سڈنی، کالرج، والٹر پیٹر، آسکر وائلڈ اور میتھو آرنلڈ وغیرہ بہتیرے نقادوں اور دانش وروں نے انسانی زندگی میں ادب کے کردار پر فکر انگیز اور بامعنی باتیں کی ہیں۔ آگے چل کر ماورے تنگ، سگمنڈ فرائڈ اور دوسرے کئی مفکرین نے اس مکالمے کو آگے بڑھایا۔ ان مذکورہ اشخاص کے نظریات کے مابین تھوڑا بہت فرق ضرور ہوسکتا ہے لیکن تمام باتیں ایک ہی مرکز پر آکر ٹھہرتی ہیں کہ ادب کو انسانی زندگی بالخصوص عام آدمی کی زندگی کا حقیقی ترجمانی ہونا چاہئے۔ اس امر کو شدومد کے ساتھ پہلی دفعہ مارکس اور پھر لینن نے اجاگر کیا۔ جس کا تذکرہ اوپر کئی مقامات پر ہو چکا ہے۔

مارکسی تنقید نگاروں اور پھر بعد میں ترقی پسند تنقید نگاروں پر اعتراضات بھی ہوئے ایک اور نئی بحث سامنے آئی کہ مارکس، لینن اور ماوزے تنگ نے جبکہ ادب پاروں کو مسخ کرنے یا ان کا حسن غارت کرنے کی بابت کچھ نہیں کہا تو پھر ان کے تابعین پر الزام کیوں عاید کیا کہ وہ مقصد کی خاطر فن کا گلا گھونٹ دیتے ہیں یہ ایک ایسی بحث ہے جو ہر جگہ Stand دکھائی دیتی ہے۔ اور ہر جگہ ترقی پسند ناقدین کی شدت

پسندی ادعائیت سامنے آتی ہے۔ ماوزے تنگ کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر نے اس بات کی توضیح کی ہے کہ ترقی پسند ناقدین نے اس کے افادی کا زکو ایک طرح سے نقصان پہنچانے کا کام کیا ہے اور قدیم ادب اور متقدمین کی تنقید اور تنقیص صرف اس بات کے لئے کی ہے کہ وہ اپنے فن پاروں میں فن کو اولیت دیتے تھے اور اپنے ماحول کو Focus کرتے تھے جو ماحول امراء اور رؤسا سے زیادہ متعلق تھا۔

بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

''.....بعض ضرورت سے زیادہ جوشیلے انقلابیوں اور انتہا پسندوں کے برعکس ماؤ نے تو ادب کی قدیم اور مروج صورتوں کو بھی برقرار رکھنے کی تلقین کی ہے۔ یہ نکتہ بہت اہم ہے اور اس کی روشنی میں اگر اپنے یہاں کے ابتدائی دور کے ان ترقی پسند ناقدین کی آراء کا جائزہ لیں جنہوں نے داستانوں اور غزل کو اس بنا پر مسترد کر دیا تھا کہ یہ سب جاگیردارانہ تمدن کی یادگار ہیں اور غالب اور میر اس لئے مطعون ٹھہرے تھے کہ انہوں نے اپنے نظام کے خلاف بغاوت کیوں نہ کی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات تک ماؤ کا یہ قول نہ پہنچا تھا۔

اگر فن و ادب کی سطح کو بلند کرنا درکار ہے تو وہ کون سی بنیاد ہے جہاں سے پہلا قدم اٹھانا ہے۔ کیا جاگیرداری نظام ہماری بنیاد کا کام دے گا کیا

پرولتاری سماج کو بنیاد قرار دے کر ہم قدم بڑھائیں گے یا پھر کیا نیم بورژوائی ماحول خشت اول کا کام دے گا؟ ان تمام سوالوں کا جواب نفی کے سوا کچھ نہیں۔ قدم اٹھانے کیلئے ہمیں کسانوں، مزدوروں کے موجودہ قائم الوقت تمدن اور رہنے سہنے کے طور طریقوں کے معیار ہی کو بنیاد قرار دینا ہوگا۔ بالفاظ دگر ہمیں فن وادب کی اسی قدیم بنیاد سے چلنا ہوگا جو مختلف اصناف کی شکل میں ہمارے سماج میں موجود ہے۔''[1]

ماؤ انقلاب پسند تھا لیکن انتہا پسند نہیں تھا۔ وہ اپنے عہد سے الگ ماضی اور مستقبل دونوں پر نظر رکھتا تھا۔ وہ ادب برائے زندگی کا قائل تو تھا لیکن ایک اعتدال اور توازن کے ساتھ وہ ادب پاروں کے ساتھ ساتھ تنقید سے بھی ایسی ہی امید اور تقاضے رکھتا تھا۔ ماؤ تنقید وتخلیق کے ذریعے عوامی اتحاد کا قائل تھا وہ ترقی کا متمنی تھا۔ اور قنوطیت سے متنفر۔ ماؤ کے اس خیال سے مارکسی نقادوں کا اتفاق تو نظر آتا ہے لیکن نظریاتی مباحث اس وقت اک تنازعے کی شکل لے لیتے ہیں جب صرف نظریاتی جنگ کو ہی مرکز اور مقصد تصور کرلیا جاتا ہے۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زمینی سطح پر عام انسانی زندگی کی فلاح و بہبود تبدیلی حالات اور سماجی تغیرات کے نظریے پس پشت پڑ جاتے ہیں اور نعرے بازی، شور وغوغا اور پروپگنڈہ ہی اصل مقصد اور نصب العین ہو کر رہ جاتا ہے۔ جبکہ ماؤ کو اس انتہا پسندی کا اندازہ پہلے ہی تھا۔ اور اس نے اس

---

[1] تنقیدی دبستان۔ ڈاکٹر سلیم اختر۔ ص۔۱۸۲

سے بچ رہنے پر زور بھی دیا تھا۔

ترقی پسند نقادوں کی انتہا پسندی کی مخالفت میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا گیا۔ ابتدا میں اس کے افادی مقاصد اور مشاہیر کی تائید کے سبب عوام اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ لیکن جب آگے چل کر اس کے روپ سامنے آتے گئے، اس سے بڑے اور آریجنل ادباء شعراء کنارہ کش ہوتے گئے۔

اس ضمن میں حامد اللہ افسر نے تفصیل سے بحث کرتے ہوئے اس کا منفی اثرات کو اجاگر کیا ہے۔ ملاحظہ کریں:

> ''نئے ادب (ترقی پسند) کا مطمح نظر یہ قرار پایا کہ اس میں حقیقت کا بیباک مشاہدہ ہونا چاہئے۔ وہ حیات کے ہر شعبہ میں ترقی چاہتا ہے وہ ادب سے بدنظمی دور کرنے اور اس کیلئے ایک مقصد اور منہاج متعین کرنے کا آرزومند ہے، وسیع ترین انسانی ہمدردی، مساوات، اور نوع انسان کی فلاح نئے ادب کے موضوعات قرار پائے.....ادبی تنقید کا رخ بھی بدلا اور اس نے آرنلڈ کے نظریہ تنقید حیات پر زیادہ زور دینا شروع کیا اور نئے ادیب اور نقاد ادب کو اس زاویہ نظر سے جانچنے لگے کہ وہ زندگی سے کہاں تک ہم آہنگ ہے اور اس میں انسانیت کی فلاح و بہبود کا کس درجہ خیال رکھا گیا ہے۔ (اس کے) مقاصد کی بلندی میں کوئی شبہ نہیں لیکن ان

مقاصد کو پورا کرنے کے لئے جو طریقہ اختیار کیا گیا اس نے اس تحریک کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کر دیں سب سے پہلی بات یہ ہوئی کہ ترقی پسند ادیبوں نے روایتی ادب کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ شاید اس وقت تک انکا سب سے بڑا کارنامہ یہی بغاوت ہے۔ تعمیر کیلئے تخریب ضروری نہیں ہے۔ روایتی ادب کیخلاف بغاوت نہ صرف غیر ضروری تھی بلکہ وہ نئے ادب (ترقی پسند) کے لئے نقصان رسا ثابت ہوئی..... اس میں شبہ نہیں کہ ادب کا جو معیار ترقی پسند ادیبوں نے قائم کیا تھا اس کا شائبہ بھی وہ پورا نہیں کر سکے۔ ان کی ساری کائنات، بھوک، افلاس، عورت اور جنسی استحصال کے اندر محدود ہو کر رہ گئی اور وہ بھی یکسر تاثیر سے خالی ہے۔

اسی کے ساتھ اکثر ترقی پسندوں نے ادب کو سراسر کمیونسٹ پارٹی کا آلۂ کار بنانا شروع کر دیا۔ اس بات سے قدرتی طور پر غیر کمیونسٹ حضرات بھڑکنے لگے اور عام طور پر یہ خیال پیدا ہو گیا کہ ترقی پسند ادیب محض اشتراکی اصولوں کی تبلیغ کے لئے رونما ہوئے ہیں۔ اس خیال نے ترقی پسند کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کیں اور اسکے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔''[1]

---

[1] تنقیدی اصول اور نظریے۔ حامد اللہ افسر۔ انوار بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۵۴۔ ص۔ ۱۹۵

حامد اللہ افسر کے محولہ بالا سیدھے سادے خیالات کے پیش نظر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جس فنی حسن کی موجودگی پر ماوزے تنگ نے زور دیا تھا اس پر ترقی پسند نقاد قائم نہ رہے اور جوش اظہار میں فنی حسن و جمال کو رد کرنا شروع کر دیا۔ بعض ترقی پسند اتنے متشدد ہوئے کہ مشاہیر اور معتبر ادبا شعرا کو سرمایہ داروں اور ملکی نظام کا دلال کہنے لگے۔

ترقی پسند تحریک اور تنقید کے نظریاتی مباحث کچھ اور تھے اور عملی طور پر کچھ اور ہو گئے۔ اس کا احساس آگے چل کر بعض اعتدال پسند ترقی پسندوں کو ہوا لیکن جب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ ترقی پسند نقادوں کے نظریے کے مطابق اردو کے تمام قدیم نثر پارے، تمام مشہور مثنویاں، داستانیں اور قصائد وغیرہ قابل مذمت قرار پائیں اور یہاں تک کہ علامہ اقبال کو اختر حسین رائے پوری نے ''اسلامی فاشسٹ'' قرار دیا۔ (ادب اور زندگی۔ اختر حسین رائے پوری مطبوعہ اردو: ۱۹۳۵) اس سلسلے میں اکبر کو قدامت پرست اور سرسید و حالی کو بھی مطعون قرار دیا گیا کہ وہ انگریزوں سے مفاہمت پر زور دیتے ہیں نتیجتاً اس انتہا پسندانہ نظریہ اور سوچ کے خلاف دیگر تنقید نگاروں نے آوازیں بلند کیں۔ ان معتدل اور متوازن فکر اور نظریہ رکھنے والوں میں مجنوں گورکھپوری، احتشام حسین، عزیز احمد وغیرہ نے قدیم ادب اور ادیبوں کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے ان کے یہاں عصری ادب کی نئی جہات کو تلاش کرنا شروع کیا۔ نظیر اکبر آبادی کی عظمت میں اضافہ اسی تلاش کا نتیجہ تھا۔ اور پھر آگے چل کر ترقی پسند نقادوں نے بھی نظیر کو پہلا عوامی شاعر تسلیم کر لیا۔

ترقی پسند تنقید کے اس نظریاتی مباحث کے پیش نظر مجنوں گورکھپوری کی مندرجہ ذیل وضاحت بہت ہی اہمیت کی حامل ہے۔ ملاحظہ کریں:

''ماضی کی اہمیت سے انکار کرنا اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا گیا ماضی کی کوتاہیوں میں اس طرح کھو کر رہ جانا کہ زندگی کی تعمیر و توسیع میں اس نے جس قدر حصہ لیا ہے اسسے بھی انکار کر دیا جائے۔ تنگ نظری اور کم ظرفی کی علامت ہے۔''[1]

آگے چل کر معروف نقاد ممتاز حسین نے بھی ماضی سے انکار کو غلط قرار دیا ہے۔ ملاحظہ کریں:

'' جب بھی انقلابی لہر اٹھتی ہے تو ماضی سے سلسلہ منقطع کرنے کا رجحان پیدا ہوتا ہے یہ غلط ہے یا صحیح لیکن یہ رجحان موجود تھا۔ ماضی کو ہم نے Dark ages سمجھا اور یہ سمجھا کہ ہم بڑی روشنی میں ہیں۔ اس کے نتیجہ میں ہمارے ہاں شدت پسندی پیدا ہوئی اور بہت سی باتیں خود میں نے بھی غلط کہیں۔''[2]

مندرجہ بالا بیانات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ترقی پسند تحریک اور اسکے تنقیدی نظریات سے اختلافات ہو سکتے ہیں لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ترقی پسند نظریات نے اردو تنقید کو اس کی

---

[1] ادب اور زندگی۔ مجنوں گورکھپوری۔ ص۔۹۲

۲۔ رسالہ ماہ نو۔ اردو تنقید کے پاس سال (مذاکرہ) جنوری۔ ۱۹۸۸ء

پرانی اور بندھی ٹکی روش سے ہٹا کر ایک نئی اور وسیع وعریض راہ پر لا کھڑا کیا۔ تاثراتی اور خیالی نقطہ نظر کی جگہ منطقی اور سائنسی طرز اظہار اس تنقید کا بڑا کارنامہ ہے۔

ہر رجحان اور اسکے قائم مباحث آگے چل کر تجزیے اور Assesment کے مرحلے سے گزرتے ہیں۔ ترقی پسند تنقید کا بھی آج کی تاریخ میں تجزیہ اور محاسبہ ہو رہا ہے اور اس نظریے کی بابت نئے سرے سے ڈسکورس قائم ہو رہے ہیں۔ شدت کا جب زور کم ہوتا ہے تو معروضیت اور سنجیدگی کے لئے راستہ کھلتا ہے۔ ترقی پسند تنقید کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔

عزیز احمد کی کتاب سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''ترقی پسند تنقید کا اہم ترین فرض یہ ہے کہ وہ سختی سے جدید تحریک کے ہر پہلو کا جائزہ لے۔ ہر رجعت پسند رجحان کو جو قدامت پرستوں کے خوف سے اس انقلابی تحریک کے سائے میں پناہ لینا چاہتا ہے بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکے۔ اب اس سے کام نہیں چلے گا کہ ترقی پسند نقاد محض نظم آزاد یا نظم عاری کی حمایت کو اپنا بڑا فرض سمجھیں یا مارکسی تنقید کے بنیادی اصول عام فہم زبان میں سمجھاتے رہیں۔ انہوں نے قدامت پسند ادبا و رادیبوں سے زیادہ اپنا جائزہ لینا ہے۔ ماضی تو اختیار میں ہے۔ اس میں سے جو چننا چاہو چن لو باقی

پھینک دو۔ لیکن حال کا ادب ایک زندہ عمل ہے۔ حال کے ادب پر تنقید مردے کا پوسٹ مارٹم نہیں زندہ مریض کا آپریشن ہے۔ اور ہر جاندار چیز کی طرح ادب بھی مرض سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ طرح طرح کے ذہنی جراثیم اس میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ادب کو صحت مند رکھتا ہے تو تنقید کا بڑا فرض یہ ہے کہ ان جراثیم کے وجود سے انکار نہ کیا جائے بلکہ ان کو جسم ادب سے خارج کرنے کی تدبیریں کی جایں۔ تب ہی ادب اور زندگی ایک ہو سکتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کی اصلاح کر سکتے ہیں۔''[1]

عزیز احمد کے بیان سے علی سردار جعفری اختلاف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

''مجھے ان کے نقطہ نگاہ کے بعد زاویے ٹیڑھے معلوم ہوتے ہیں۔''[2]

عزیز احمد کے محولہ خیالات پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے علی سردار جعفری فرماتے ہیں کہ ''عزیز احمد کے پایہ کے دانش ور سے کلیے سے بھرپور ایسے اسلوب نقد کی توقع نہیں تھی۔''

اردو میں اور بھی کئی دوسرے ترقی پسند ناقدین پر نگاہ ڈالیے تو اندازہ ہوگا وہ ادب کو اقتصادی ارتقا کی پیداوار بنانا چاہتے ہیں۔ ان نقادوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو مارکس کے تاریخی تصور اور جدلیاتی مادیت کو خاطر میں نہیں لاتے اور نہ ہی اس پر عمل درآمد سے کسی مثبت نتیجے کی توقع رکھتے ہیں۔ کچھ ناقدین

---

[1] ترقی پسند ادب۔ عزیز احمد۔ ص۔ ۱۳۴ [2] ترقی پسند ادب، ۔علی سردار جعفری۔ ص۔ ۱۱۷

ادب کوایک ایسا سماجی رجحان سمجھتے ہیں جس کے ذریعے معاشرے میں انقلاب لایا جاسکتا ہے۔ یہ الگ الگ خیالات الگ الگ وقتوں میں سامنے آتے ہیں۔لیکن ایک بات قابل اعتراف ہے کہ ترقی پسند ناقدین نے اپنی اپنی بساط کے مطابق ادب کوعصری شعور اور زمینی حقائق سے قریب تر کرنے کی کوشش کی۔ ترقی پسند تحریک کے Followrs میں صرف کمیونسٹ تھے، ایسا سمجھنا مغالطے میں پڑنے کے مترادف ہے۔اس میں کئی دیندار اور مذہبی قسم کے ادبا اور دانش ور بھی تھے جو ترقی پسندوں کی انہیں باتوں کی تائید کرتے تھے جو فرد اور سماج کی فلاح و بہبود سے متعلق تھیں۔ ایسے ناقدین اور ادبا جیسا کہ گزشتہ سطور میں عرض کیا گیا کہ اعتدال پسند تھے اور معاشرے میں تبدیلی چاہتے تھے لیکن اس طرح نہیں کہ ادب صرف پروپگنڈہ اور شور شرابہ بن کر رہ جائے۔ترقی پسند ناقدین میں ایک طرف سجاد ظہیر، اختر حسین رائے پوری، ممتاز حسین، عبدالعلیم، احتشام حسین، علی سردار جعفری اور محمد حسن جیسے اشتراکی ناقدین تھے تو دوسری جانب اختر اورینوی عزیز احمد، اختر انصاری، اعجاز حسین، عبادت بریلوی اور پروفیسر آل احمد سرور جیسے نقاد بھی تھے جنھوں نے مارکسی تنقید کو پوری طرح اپنایا تو نہیں لیکن اس کے بعض اہم نکات کو شعر و ادب کیلئے لازمی قرار دیا۔ان میں سے کئی ناقدین ایسے بھی ہیں جنھوں نے اشتراکی نظریات اور اشتراکی طریقہ تنقید سے اختلاف بھی کیا ہے۔

اس ضمن میں ڈاکٹر تنویرہ خانم کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

''یہ ناقدین مارکسی اور اشتراکی نظریات کے کئی پہلوؤں سے

اختلاف رکھتے تھے۔ اگر چہ بیشتر نظریات وخیالات میں یہ نقاد مارکسی نقادوں سے متفق تھے خاص طور پر چند بنیادی باتیں ان تمام لوگوں میں اقدار مشترک کی سی حیثیت رکھتی ہیں۔ان میں سے بعض نقاد صرف اس حد تک اشتراکی اور مارکسی نقادوں سے اتفاق کرتے ہیں کہ سیاست کے اثرات ادب پر پڑتے ہیں۔اور ادب کی سیاست سے وابستگی بھی ضروری نہیں مانتے ہیں۔لیکن ان کے نزدیک کسی خاص سیاسی نظریے کا پرچار کرنا وہ اپنے لئے ضروری نہیں سمجھتے۔ یہ تمام نقاد ادب کو زندگی کا ترجمان سمجھتے ہیں۔اور ادب کو زندگی سے ہم آہنگ کرنے کے شدومد سے قائل ہیں۔ وہ ادب کو سماجی فریضہ قرار دیتے ہیں۔اور ادب ان کے نزدیک تاریخی ارتقا سے الگ تھلگ نہیں ہے۔ وہ ادب کے افادی پہلوؤں کو بھی نظر نداز نہیں کرتے۔ اوران ہی میں سے اختر انصاری جیسے نقاد صاف طور پر ادب کو پروپگنڈہ بھی قرار دیتے ہیں۔اسی طرح ایک دوسرے غیر مارکسی نقاد عزیز احمد ادب کا ترجمان اور نقاد سمجھتے ہوئے بھی اشتراکی تنقید کا طبقاتی نظریہ تسلیم نہیں کرتے۔ وہ مارکسی نقادوں کی طرح اشتراکی حقیقت نگاری کو بھی قبول کرنے کیلئے تیار دکھائی نہیں دیتے کیونکہ ان کے نظریے کے مطابق ادب

اورفن کوآزادی ملنی چاہئے اوراشترا کی حقیقت نگاری چونکہ ادب اورادیب کو پابند کردیتی ہے اس لئے اشترا کی حقیقت نگاری کافنی طریقہ کاراورنظریہ ان کی نگاہ میں درخوراعتنانہیں ٹھہرتا۔ وہ دیگر غیر مارکسی نقادوں کی طرح ادب کی سماجی اہمیت کے قائل ہوتے ہوئے بھی ادب کے ذریعے اشترا کی اصولوں کے پرچارکواپنانصب العین نہیں بناتے۔''[1]

محولہ اقتباس کی روشنی میں ہم وحیداختر، باقر مہدی، تبسم کاشمیری، محمد علی صدیقی، آغا سہیل، وارث علوی اورفضیل جعفری کا ذکر بھی کرسکتے ہیں۔ یہ ناقدین مارکسی نہیں لیکن انہوں نے جابجا ترقی پسندنظریہ فن سے استفادہ کیا ہے اور جہاں ضروری معلوم ہوا ہے انہوں نے ترقی پسندوں کی بعض باتوں کومسترد بھی کیا ہے۔

اردو میں ترقی پسند کے ابتدائی دور کے ناقدین میں کئی اہم نام سامنے آتے ہیں۔ان میں اختر حسین رائے پوری، سجاد ظہیر، عبدالعلیم، مجنوں گورکھپوری، اعجاز حسین اورفیض احمد فیض کے نام خصوصیت سے لئے جاسکتے ہیں۔ان ناقدین نے اس طرز تنقید کی بنیاد کے وقت نئے تنقیدی اورنظری مباحث کا آغاز کیا۔اس لئے ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ان کے نئے تنقیدی مباحث نے اردو زبان وادب کوفکری اورنظری سطح پر وسعت اورتنوع سے ہمکنار کیا۔ اورتخلیق وتنقید کے سامنے ایک ایسا پیمانہ اور ضابطہ رکھا جس کو اپنا کر ادیب یا ناقد صحیح معنوں میں فرد ومعاشرہ کے لئے مفید ثابت ہوسکتا ہے۔

---

[1] ترقی پسند تنقید۔ڈاکٹر تنویرہ خانم۔تخلیق کردہ۔شاہ عالم گیٹ لاہور۔۱۹۸۴۔ص۔۸۱

درج بالا صفحات پر ترقی پسند تنقید کے اہم نظریاتی مباحث کو پیش کیا گیا اس ضمن میں اس طرز تنقید کے بنیاد گزاروں سے لیکر اردو کے نقادوں کے نظریات کو بھی سامنے رکھا گیا تا کہ اردو میں ترقی پسند تنقید کے آغاز وارتقا اور اس کے بنیادی نکات کی بہ آسانی افہام وتفہیم ممکن ہو سکے۔

(ب) ترقی پسند تنقید کا عہد بہ عہد ارتقا

اردو ادب کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اردو میں نظریاتی تنقید کا آغاز ۱۹۳۶ء سے یعنی ترقی پسند تحریک کی آمد سے شروع ہوتا ہے۔ حالانکہ ۱۹۳۶ء سے قبل بھی امداد امام اثر اور حالی کے یہاں تنقیدی اصول اور کچھ مخصوص نظریات موجود تھے۔ مغربی ادبیات کی طرف نظر اٹھائیں تو افلاطون اور پھر اسکے شاگرد ارسطو کے تنقیدی خیالات کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے وہ اس لئے کہ وہ لوگ تنقید کی بنیاد ڈال رہے تھے۔ یہاں مغربی ناقدین اور مفکرین کا ذکر تفصیل سے نہ کرتے ہوئے اردو ادب کے تناظر میں ترقی پسند تنقید کے آغاز اور اس کے عہد بہ عہد ارتقاء پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ساتھ ہی ان مغربی افکار و نظریات اور مفکرین و ناقدین کو بھی حوالے کے طور پر لیا گیا ہے۔ جن سے اردو کی ترقی پسند تنقید نے استفادہ کیا ہے۔ اور اپنے نظریے کو مستحکم کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس سے قبل کے سطور میں یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ ترقی پسند تنقید مارکسی تنقید کی ہی دوسری شکل ہے۔

اس طرز تنقید کا آغاز کارل مارکس اور اس کے حامی لینن کے ذریعے ہوتا ہے۔ مارکس کے متعلق کہا جاچکا ہے کہ اس کا نظریہ ادب کو سامنے رکھ کر وضع نہیں کیا گیا ہے اور نہ ہی اس نے اپنے دور یا اس سے قبل کے ادب پاروں کے متعلق کچھ زیادہ کہا۔ مارکس نے سیاسی معاشیات میں ادب اور معاشرے کے باہمی تعلق کے متعلق اظہار خیال کیا۔ اور ادب کو بھی سماجی شعور کا ایک اہم جز قرار دیا۔ مارکس کے نظریے کی بنیاد یہ تھی کہ مادی زندگی کا نظام پیداوار انسان کی پوری زندگی، اس کے تمام احوال و کوائف پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس طرح ادیب بھی اس سے اچھوتا نہیں رہ سکتا۔ مارکس اور لینن میں یہ فرق ہے کہ لینن نے باضابطہ ادب کو اپنا موضوع بنایا اور مارکسیت کی رو سے کچھ ضابطے مقرر کئے۔ خاص طور سے اس نے قدیم ادب پاروں کو اپنے ضابطے کی کسوٹی پر دیکھنے پرکھنے کا کام کیا۔ اور اس پرکھ کے لئے اس نے مارکس نے جدلیاتی مادیت کو اپنا ماڈل مقرر کیا۔ لینن ادب پر بحث کرتے ہوئے ان امور پر پوری توجہ مرکوز رکھتا ہے۔ جن میں ادبا کے ذریعہ معاشرے کو آئینہ کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔ ترقی پسند تنقید کی بنیاد ڈالنے میں اور اس کو پہلی دفعہ شدومد کے ساتھ منظر عام پر لانے میں مارکس اور لینن کے تاریخی کارناموں کو کسی طور پر فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

مارکس اور لینن کے نظریات ادبی تنقید کے لئے ایک نئے موڑ کی طرح ہیں۔ ادب میں ان کے نظریات کو بڑے پیمانے پر قبول کیا گیا ہے۔ نیز ادب میں نظریے کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا گیا۔ یعنی بغیر کسی نظریے یا نصب العین کے ادب کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ صرف تفریح اور دل بستگی ہی اگر کسی ادب

کا مقصد ہو تو بات اور ہے۔ لیکن ادب کو زندگی کا آئینہ کرنے کے لئے کسی نہ کسی صحت مند نظریے کا ہونا لازمی ہے۔ معروف مارکسی نقاد پروفیسر محمد حسن نے بھی نظریے کو ادب کے لئے بہت ضروری قرار دیا ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے فنی التزام پر بھی زور دیا ہے۔ ان کے مطابق:

''رویہ یا نظریہ ادب کیلئے ناگزیر ہے مگر محض رویہ یا نظریہ فن نہیں ہے محض اس کے بل پر تخلیقی کارنامے ممکن بھی نہیں۔ خیال کتنا ہی خوبصورت کیوں نہ ہو اگر وہ تجربے میں ڈھل کر اور شخصیت کا حصہ بن کر تخلیقی عمل کے ذریعہ کندن بن کر نہ آئے بھونڈا ہی رہے گا۔ رویہ اور نظریہ کیلئے ضروری ہے کہ وہ فیشن اور فارمولا نہ ہو صرف ذہن اور دماغ کو مطمئن نہ کرے شخصیت اور تجربے کا اس طرح جزو بن جائے کہ وہ خارج سے عائد کیا ہوا نہ ہو بلکہ فنکار کی داخلی تلاش و جستجو اس کی اپنی دریافت بن جائے۔ جب تک یہ رویے یا نظریے بناوٹی، خارجی یا اوپر سے عائد کئے ہوئے یا دوکان کی رونق بڑھانے کیلئے خود اختیار کئے ہوئے ہوتے ہیں اس وقت ادب پروپگنڈہ کی سطح سے نہیں اٹھتا لیکن رویے سے فرار ممکن نہیں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ فنکار آنکھیں موند کر غیر جانبداری اور بے تعلقی کے دھوکے میں اپنے دور کے غالب نظریوں اور رویوں کو اپنا لے اور تبدیلی کی جگہ جمود اور انقلاب کی جگہ

اقتدار کا آلہ کار بن جائے۔''[1]

مندرجہ بالا اقتباس میں پروفیسر محمد حسن نے جن امور کی طرف اشارے کئے ہیں ان کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ادب میں رویے اور نظریے کی اہمیت مسلم ہے لیکن کوری تقلید ضرر رساں ہے۔ اس سے ادب کا بھی زیاں ہوتا ہے اور ادیب کا بھی۔ مارکس نے جن خیالات و نظریات کو پہلی دفعہ پیش کیا انسانی معاشرہ کی صحت مند تبدیلی کیلئے از حد لازمی تھے۔ وہ تغیر کو فطرت کا اصول سمجھتے ہوئے سماج میں حالات کے مطابق تبدیلی اور تغیر کو ضروری سمجھتا ہے۔ مارکس نے اپنے خیالات سے دنیا بھر کے ادبا شعرا اور دانش وروں کو یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ اس کے خیالات زندگی کے ہر شعبے کی بہتری کیلئے بہت ضروری ہے۔ مارکس کے نظریات نے پورے یورپ کے دانش وروں کو نہ صرف متاثر کیا بلکہ انہیں متحرک بھی کر دیا۔ یورپ میں ہندستانی طلبا کا وہ گروپ جو حد درجہ حساس اور باخبر تھا اس نے مذکورہ نظریات کو اپنایا۔ اس کے سامنے یورپ اور دنیا بھر کے تغیرات کے سانحات و واقعات تھے۔ ان طالب علموں میں سجاد ظہیر، جیوتی گھوش، ملک راج آنند، پرمود سین گپتا اور دین محمد تاثیر خاص تھے۔ انہوں نے پہلی دفعہ لندن میں ایک نشست کی اور ترقی پسند رجحان کو ہندستان میں لے جانے کا تہیہ کیا۔ سجاد ظہیر کی مساعی سے اردو کے ساتھ ہندستان کی دیگر زبانوں اور بڑے ادباء اور دانش وروں کی توجہ مرکوز ہوئی۔ اسی موقع سے ترقی پسند تحریک کا ایک منشور بھی تیار کیا گیا جس کا بنیادی نصب العین عصری شعور، نئے

---

[1] جدید اردو ادب۔ ڈاکٹر محمد حسن۔ ۱۹۷۵ء۔ ص۔ ۲۳۹

حالات سے آگہی سے باخبر کرنا تھا۔تاکہ ہندستانی سماج تغیر وتبدل کے فطری مرحلے سے گزر کر آزادی کی فضا میں سانس لے سکے۔ ہندستان کے بیشتر صوبوں میں ترقی پسند تحریک کی انجمن'' انجمن ترقی پسند مصنفین'' قائم ہوئی۔انجمن نے اپنے اعلان میں یہ واضح کیا کہ کل تک ادب فراریت کا شکار رہا ہے رجعت پرستی اور استحصالی نظام کے چنگل میں پھنسا رہا ہے۔لہٰذا اب وقت آ گیا ہے کہ اسے خوابوں کی دھوکہ بھری دنیا سے باہر نکال کر حقیقت کے روبرو کیا جائے۔اس موقع سے سجاد ظہیر نے اپنی تصنیف ''روشنائی'' میں ترقی پسندوں کے موقف کی وضاحت بہت ہی تفصیل سے کی ہے۔اور اس انجمن کی سرگرمیوں کو منعکس کیا ہے۔ روشنائی کا انگریزی ترجمہ امینہ اظفر نے کیا ہے۔ انگریزی میں اس کا ترجماہ The light کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔The light سے سجاد ظہیر کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں:

The thought, views and belife of the human mind neither occur of their own, nor are they devinely revealed. Material conditions of life, or those means and methods, those instruments and implements of production, and communications, using which human beings are able to feed themselves, and find shelter, determine the form that human society takes; Human society is comprised of different classes

of people and their mutual relationship are themselves the creations of material condition of life, and are subject to change." 1

سجاد ظہیر کا ترقی پسند تحریک کے تئیں Concept بہت واضح تھا۔ ان کے یہاں خلوص کے ساتھ تعمیر کے پہلو بھی تھے۔ سجاد ظہیر دوسرے ترقی پسند ادیبوں اور ناقدوں کی طرح اشتعال اور درشتگی نہیں بلکہ ایک متانت اور سنجیدگی کا رویہ تھا جو تحریک کے آغاز سے ان کی زندگی کے اختتام تک موجود تھا۔

سجاد ظہیر اور ان کے رفقا کی سعی مسلسل کا نتیجہ تھا کہ اردو اور ہندستان کی دیگر زبانوں میں ترقی پسند ادب کی طرف رجحان بڑھا۔ جواد باشعرا اور ناقدین پرانی، فرسودہ اور غیر افادی تخلیقات کے دلدادہ تھے۔ انہوں نے اس نظریے سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی روش بدلی اور معاشرہ کو اپنا موضوع بنایا۔ معروضیت اور حقیقت پسندی کا رواج عام ہوا۔

اردو تنقید نے بھی ترقی پسند تحریک کے نظریات اور مینی فیسٹو کو اپنایا۔ کہیں ناقدین نے اسے پوری طرح انگیز کیا تو کہیں جزوی طور پر لیکن لب ولہجہ اور طریقہ تنقید بدلا مدلل مداحی غیر ضروری ہجو اور عیب جوئی کے درمیان سے راستہ نکلا اور یہ راستہ بالکل معتدل اور متوازن تھا۔ منطقی اور معروضی تھا۔ اس سے قبل

---

1. The light (a translation of Roshnai by Amena Azfar) Oxford University Press, Karachi, Pakistan. 2006 Pg. 30-31

الطاف حسین حالی نے اردو میں اپنی مشہور زمانہ تصنیف مقدمہ شعر وشاعری کے ذریعہ اردو ادب کا مزاج بدلنے کی کوشش کی۔ اور حقیقت کے قریب آنے کی ترغیب دی تھی۔ یہاں فرق صرف اتنا تھا کہ حالی نے اپنے زمانے کو سامنے رکھا تھا اور ادب میں زیادہ تر اخلاقی اور حقیقی پہلوؤں پر زور دیا تھا۔ جبکہ ترقی پسندوں نے اردو تنقید کو سماجی مسائل کی طرف متوجہ کیا۔ اس ضمن میں اسلوب احمد انصاری نے ان بعض اہم مسائل کی طرف اشارے کئے ہیں جو اس زمانے کے پیش نظر تھے۔ وہ رقم طراز ہیں:

''اس امر کے ماننے میں تامل کی گنجائش نہیں کہ ادب کا تعلق زندگی سے گہرا اور غیر منفصل ہے۔ ادیب بھی عام انسانوں کی طرح جذبات، خیالات اور شعور رکھتا ہے اور اسے اس زندگی سے عہدہ برآمد ہونا پڑتا ہے۔ جو اس کے اردگرد پھیلی ہوتی ہے۔ حقیقت سے کامیابی کے ساتھ مفاہمت کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ اول عملی طور پر اس کے بطن میں تبدیلی پیدا کر کے یا فنی طور پر اس کی نئی تعبیر وتغیر پیش کر کے۔ ادب کے مسائل وسیع طور پر کلچر کے مسائل سے علیحدہ نہیں ہیں اب تک انسان نے جس طور سے زندگی بسر کی ہے اس کا نقش حال کے فکر اور برتاؤ کے ڈھانچے پر موجود ہے۔ اور آج زندگی سے جو نتائج پیدا ہو رہے ہیں یا ہو سکتے ہیں وہ لازماً مستقبل کی تشکیل میں استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ ادب کا مقصد اپنے مخصوص طریقہ کار کے لحاظ

سے ان معیاروں کو پرکھنا اور ان پر حکم لگانا ہے۔ کوئی بھی فنکار خواہ وہ انتہائی معروضی نقطہ نظر کیوں نہ اختیار کرے۔ ان بنیادی تقاضوں سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ تخلیق کے پس پشت جو محرک ہے وہ ایک حد تک صاف اور سادہ ہے یعنی انسانی تجربے کے کسی خاص پہلو کی چھان بین اور اس کی بنیاد پر حقیقت کی کوئی نئی ترجمان۔''[1]

محولہ بالا اقتباس کی رو سے کہا جا سکتا ہے کہ پرانے سسٹم کو بدلنے کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہئے کہ نئے نظام میں پرانے نظام سے بھی زیادہ خرابیاں در آئیں۔ یعنی ادب کو اپنے زمانے کے تقاضے کے مطابق تغیر و تبدل کے مرحلوں سے ضرور گزرنا چاہئے۔ لیکن وہ اس طرح گزرے کہ معاشرے اور سماج میں بہتر سے بہتر صورت حال پیدا ہو جائے۔ مارکس کے نظریات بھی گھما پھرا کر یہی عندیہ دیتے ہیں۔ اور اردو کے مارکسی نقاد انہیں نظریات کو سامنے رکھ کر ادب کا جائزہ لیتے ہیں۔ مارکس کے نظریات چونکہ پہلی دفعہ اردو میں ترجمے کی صورت میں پیش ہوئے اس لئے ان پر اعتراضات کی بوچھار بھی ہوئی۔ لیکن مارکس کے وہ خیالات ایک طرح سے اردو کے مارکسی نقادوں نے چھپا لئے جن میں ادب کی تخلیق کے دوران فنی حسن، فنی اقدار اور جمالیات کی موجودگی کو بھی لازمی قرار دیا گیا تھا مارکس ان اوصاف کے بغیر ادب تنقید کو ادھورا تصور کرتا تھا۔ اردو کے اکثر مارکسی نقادوں نے ترقی پسند تنقید کو شدت قطعیت اور ادعائیت کا شکار

---

[1] ادبی تنقید کے چند مسائل۔ اسلوب احمد انصاری۔ (تنقیدی نظریات۔ مرتبہ احتشام حسین۔ ص۔ ۲۲۱

بنایا۔ لیکن ان میں کئی اعتدال پسند نقاد بھی تھے۔ جنہوں نے سماج، ماحول، انسانی مسائل اور مزدوروں محنت کشوں کے ساتھ فن کے تقاضوں کو بھی ضروری گردانا ہے۔ اس سلسلے میں اسلوب احمد انصاری نے بجا تحریر کیا ہے۔

''ادب جس میں زندگی کی توانائی اور اس کے فروغ کا حسن بھی ہے اور ماضی کی روایات کا احترام بھی جو زندگی اور ادب کو جامد اور سکوتی شے تصور نہیں کرتا بلکہ ان کی جدلیاتی حیثیت کا قائل ہے۔ جس کے مطابق نقاد کی حیثیت صرف استاد یا مفسر کی ہی نہیں بلکہ اس فنکار کے رازداں کی سی ہے جو ارتقا پذیر سماج میں انسان کی تقدیر سے دست و گریباں ہے جس کا کام نہ تاثرات کی بوقلمونی کا عکس اتارنا ہے نہ تحت الشعور کے پر اثر دھندلکوں میں کھو جانا۔ جو فنکار کی باز آفرینی پر قناعت کر سکتا ہے۔ نہ میکانکی جبریت کے اصول پر۔ ریاضی قطعیت کے چند بے مصرف نتائج کے اخذ کرنے پر بلکہ جو حقیقت کا جدلیاتی تصور رکھتا ہے اقدار کی ترتیب و تنظیم سے بڑھ کر ان کی پرکھ کو مطمح نظر بناتا ہے۔ اور جذباتی ردعمل کی شدت کو خارجی حقیقت کے ادراک میں پیوست کر کے اپنے نتائج کو معروضی انداز میں پیش کرنے پر زور دیتا ہے۔''[1]

الطاف حسین حالی کا ذکر اردو تنقید کے آغاز اور ارتقا کے ضمن میں آ چکا ہے۔ حالی اردو کے پہلے نقاد

---

[1] سائنٹفک نظریہ تنقید۔ اسلوب احمد انصاری۔ مرتبہ ابن فرید۔ ص۔ ۱۰۰

ہیں جنہوں نے مغربی افکار سے استفادہ کرتے ہوئے دوسرے ادب پاروں کی طرح تنقید کو افادی، مقصدی اور نظریاتی بنانے پر زور دیتے ہیں۔ حالی وقت کے تغیرات کو دیکھ رہے تھے اور اردو کے تنقیدی سرمایے کو بھی دیکھ رہے تھے۔ دونوں میں کوئی تال میل نہیں تھا۔ اس لئے انہوں نے نئے تنقیدی شعور اور جدید میلانات کی طرف توجہ کی۔ اپنے مقدمے میں اردو ادب کے تعلق سے بنیادی نوعیت کی بحث کی۔ مغربی ناقدین اور مفکرین کے نظریات کو پیش کیا۔ اور اردو تنقید کو ایک نئے جہاں سے مرصع کرنا چاہا۔ ظاہر ہے حالی کی یہ کوشش پرانی تنقید (یا تذکرے) کو منسوخ کرنے اور بنیادی امور پر سنجیدہ اور منطقی گفتگو کرنے کی طرف ایک واضح اشارہ تھی۔ اس باب میں کلیم الدین احمد نے لکھا ہے:

> ''اردو تنقید (پرانی تنقید) کی ابتدا حالی سے ہوتی ہے۔ پرانی تنقید محذوف و مقصود کے جھگڑوں، زبان و محاورات کی صحت، اسناد کی ہنگامہ آرائی تک محدود تھی۔ حالی نے سب سے پہلے جزئیات سے قطعہ نظر کی اور بنیادی اصول پر غور و فکر کیا۔ شعر و شاعری کی ماہیئت پر کچھ روشنی ڈالی اور مغربی خیالات سے کچھ استفادہ کیا۔ اپنے زمانہ، اپنے ماحول، اپنے حدود میں حالی نے جو کچھ کیا وہ بہت تعریف کی بات ہے۔ وہ اردو تنقید کے بانی بھی ہیں اور اردو کے بہترین نقاد بھی ہیں۔''[1]

---

[1] اردو تنقید پر ایک نظر۔ کلیم الدین احمد۔ ص۔ ۱۸۷

کلیم الدین احمد کے اس اعتراف سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو میں ترقی پسند تنقید کے آغاز (غیر اعلانیہ) میں حالی کا اہم کردار تھا۔ ۱۹۳۶ء کے بعد یہی رجحان واضح اور متنوع شکل میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے ذریعہ منظر عام پر آئے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین نے اپنے اعلان نامہ میں زندگی سے فراریت، ہیئت پرستی کھوکھلی روحانیت کوری ماضی پرستی نسلی تفوق، گروہ بندی اور ظلم و جبر اور استحصال کو سماج کے لئے مہلک بتایا اور اس کی جگہ عقلیت اور حقیقت نگاری کو لازمی قرار دیا۔ ادیب کو سماج کا ذمہ دار فرد تصور کیا گیا اور مزدوروں، محنت کشوں کی حمایت میں افکار و نظریات کی بالتفصیل صراحت و وضاحت کی گئی۔ ادب اور سماج کے آپسی رشتوں کو مستحکم کرنا ترقی پسند تنقید کا اہم فریضہ ٹھہرا۔ اردو میں جن نقادوں نے مارکسی نقطہ نظر کو اپنا کر اردو تنقید کے رخ کو بدلنا چاہا ہے ان کی فہرست طویل ہے۔ ان میں خاص طور سے اختر حسین رائے پوری، سجاد ظہیر، مجنوں گورکھپوری، عبدالعلیم، سید احتشام حسین، اختر انصاری، ممتاز حسین، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر محمد عقیل رضوی، وحید اختر، علی سردار جعفری، علی احمد فاطمی وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

اردو کے ترقی پسند ناقدین میں باضابطہ طور پر اختر حسین رائے پوری کا نام آتا ہے۔ انہوں نے اپنے مضمون ادب اور زندگی میں اپنے ترقی پسند نظریات کو بہت تفصیل اور وضاحت کے ساتھ پیش کیا۔ اس کے علاوہ بھی کئی مضامین شائع ہوئے۔ ان کا یہ پہلا مضمون تھا جس نے اردو کے قلم کاروں کو نئے طریقے سے سوچنے اور سمجھنے پر آمادہ کیا اور ذہنوں کو بدلنے کا کام انجام دیا۔ وہ اردو کے اولین نقاد ہیں

جنہوں نے پہلے پہل ترقی پسند تحریک کی حمایت شدومد کے ساتھ کی اور ادب برائے ادب کے نظریے کو باطل قرار دیتے ہوئے اسے معاشرے کیلئے حد درجہ نقصان دہ ثابت کیا۔ ان کے چند اقتباسات ملاحظہ کریں:

''ادب برائے ادب کے علم برداروں کا خیال ہے کہ روح اور خدا کی طرح ادب بھی کوئی فوق الناس (Super Organe) شے ہے اور جس طرح حسن و حقیقت کا عام معیار نہیں جانچا جاسکتا اسی طرح سے ادب سے سرور و حظ اسی حالت میں حاصل کیا جاسکتا ہے کہ اسے سماج کی پابندیوں سے الگ رکھا جائے۔''[1]

''زندگی کا ڈھانچہ مکمل اور واحد ہے۔ اس میں سائنس، آرٹ اور فلسفہ کے مختلف خانے پیش نہیں کہ جس کا جی چاہے کہہ دے کہ مجھے زندگی سے کیا غرض، میں اپنے لئے زندہ ہوں اور چیزوں کی طرح فن و ادب بھی زندگی کے پروردہ اور خادم ہیں۔''[2]

''.....ادب کا فرض اولین ہے کہ دنیا سے قوم، وطن رنگ و نسل اور طبقہ و مذہب کی تفریق کو مٹانے کی تلقین کرے اور اس جماعت کا

---

[1] ادب اور زندگی۔ اختر حسین رائے پوری۔ ص۔ ۴۲

[2] ادب اور زندگی۔ اختر حسین رائے پوری۔ ادب اور انقلاب۔ ص۔ ۱۲

ترجمان ہو جو اس نصب العین کو پیش نظر رکھ کر عملی اقدام کر رہی ہے۔''[1]

''ادب اور انسانیت کے مقاصد ایک ہیں ادب زندگی کا ایک شعبہ ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ مادی سرزمین میں جذبات انسانی کی تشریح وتعبیر کرتے ہوئے وہ روح القدس بنے اور عرش پر جا بیٹھنے کا دعوی کرے .....ادب ماضی، حال اور مستقبل میں رشتہ جوڑتا ہے۔ اور رنگ ونسل اور ملک وقوم کی بندشوں کو توڑ کر بنی نوع انسان کو وحدت کا پیغام سناتا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ اتنے اہم معاشی فریضے کو ایک فنکار اپنی ذاتی ملکیت سمجھے۔''[2]

اختر حسین رائے پوری کے مندرجہ ذیل اقتباسات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پرانے طرز تنقید کی جگہ اردو میں نئے رجحان اور نئی تنقید کے حامی ہیں۔

تاریخ کے اوراق پارینہ پر نظر ڈالیں تو ہمیشہ سے رد وقبول کا سلسلہ جاری رہا ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔ کیونکہ یہی رسم زمانہ ے اور یہی عین فطرت ہے۔ معاشرے میں جب بھی کوئی نیا رجحان آتا ہے، پرانے خیالات کی جڑیں ہلنے لگتی ہیں اور بسا اوقات یہ خیالات منہدم بھی ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ فطری عمل

---

[1] ادب اور زندگی۔ اختر حسین رائے پوری۔ ادب اور انقلاب۔ ص۔ ۲۱۔۲۲

[2] ادب اور زندگی۔ اختر حسین رائے پوری۔ ادب اور انقلاب۔ ص۔ ۲۱۔۲۲

وقوع پذیر نہ ہوتو دنیا میں رنگ آمیزی کا امکان جاتا رہے گا۔ جب کوئی نیا نظریہ یا خیال وارد ہوتا ہے تو لوگ اس کی طرف متوجہ ہوتے، اسے اپناتے ہیں لیکن یہ اسی وقت تک ہوتا ہے جب تک کہ اس سے بہتر اور مفید کوئی نیا نظریہ اور خیال نہ آجائے۔ جب پرانی چیزیں اپنا اثر کھودیتی ہیں تو نئی چیزیں زندگی کی مادی کشمکش سے پیدا ہوکر آدمی میں نئے خیال، نئی فکر اور نئے حوصلے بھرتی ہیں جب کوئی سسٹم اپنے بڑھنے اور ترقی کرنے کا حوصلہ چھوڑ دیتا ہے اور نئے پیدا ہونے والے رجحانات کی آندھی کو روک نہیں پاتا تو ایسی ہی صورت میں انقلابات ہوتے ہیں۔ اور نتیجے کے طور پر سارے پرانے خیالات اور افکار کے محلات زمین بوس ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے اس نئے پرانے میلانات کے زیروزبر کے تو زیر اثر ادبیات بھی آتے ہیں۔ اس لئے سماجی تغیرات کے اثرات ادب پر براہ راست پڑتے ہیں۔ ترقی پسند رجحانات نے اردو ادب میں یہی کام کیا کہ تمام پرانے خیموں کو اکھاڑ دیا اور نئے سرے سے خیمہ اندوزی شروع ہوئی۔ ترقی پسند تنقید نے یہ حکم جاری کیا کہ تغیرات کی چال سیدھی نہیں ہوتی ہے بلکہ مادی وجود کے پیہم تصادمات سے چیزیں نئی صورت لیتی ہیں اور یہ سلسلہ جاری وساری رہتا ہے۔

اختر حسین رائے پوری وقت کے ساتھ ادب کو بھی چلتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

> ''بنگال جو تمام قومی تحریکوں کا جنم داتا تھا اس ہیجان کا خاموش تماشائی نہ تھا۔ ہندستان میں بنگال سے زیادہ وطن پرست کوئی نہیں۔ اس کا جوش اس ندی کی طرح ہے جس کی جوانی مونسون کے دم تک ہے۔ جب وہ

امنگ میں آتی ہے تو وہ اپنے سامنے کسی بند کو ٹکنے نہیں دیتی۔ اس ہنگامہ خیز دور میں جتنی سیاسی تحریریں قلم بند ہوئیں ان کا شمار ناممکن ہے۔ یہ جوش تو آیا گیا ہوا، چیز باقی رہ گئی وہ نیا دور تھا جو بنگال کے آرٹ اور ادب کی دنیا میں شروع ہوا اور اب تک چلا جارہا ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ زمانہ بڑے بڑے ہنگاموں اور انقلابوں کی یاد صرف ان چند لکیروں اور محاوروں میں چھوڑ جاتا ہے جو کسی ملک کے طرز تعمیر اور طرز بیان میں رہ جاتے ہیں۔''[1]

محولہ اقتباس کو نظر میں رکھتے ہوئے اگر ہم مغربی دانش وروں مثلاً والٹر پیٹر، آسکر وائلڈ اور کروچے وغیرہ کو پڑھیں تو اندازہ ہوگا کہ یہ مفکرین ادبی انداز کو سماجی اقدار سے بالکل مختلف تصور کرتے تھے۔ اس کا سبب یوروپ کا صنعتی انقلاب بھی ہے جس کی وجہ سے سرمایہ دارانہ نظام میں ایسے تضادات پیدا ہوگئے تھے کہ ادیب اپنے ماحول سے نالاں تھا۔ وہ کبیدہ خاطر تھا۔ وہ بھاگنا جانتا تھا لیکن اسکے پیروں میں سماج کی زنجیریں پڑی تھیں۔ وہ جسمانی طور پر فرار تو حاصل نہ کرسکا۔ لیکن معاشرے کے مسائل سے ضرور بے پرواہو گیا اور یہی لاپروائی ادب کے لئے نقصان دہ ثابت ہوئی۔ اختر حسین رائے پوری کی تنقید گرچہ بہت سے مقامات پر تضادات اور شدت کا شکار ہو جاتی ہے لیکن انہوں نے ادیب کی ذمہ داری کی طرف بہت واضح اشارے کئے ہیں اسلئے کہ اگر وہ اپنا فرض ادا نہیں کرے گا تو سب کچھ تلف اور برباد ہو کر رہ جائیگا۔

---

[1] ادب اور انقلاب۔ اختر حسین رائے پوری۔ ص۔ ۱۰۰

اردو میں ترقی پسند تنقید کے باضابطہ آغاز کا سہرا اختر حسین رائے پوری کے سر جاتا ہے۔ ان کے مضامین میں ''ادب اور زندگی'' کے علاوہ

۱۔ سوویت روس کا ادب

۲۔ ادبی ترقی پسندی کا مفہوم

۳۔ سوویت تھیٹر

۴۔ بنگال کا باغی شاعر

۵۔ اردو شاعری میں عورت کا تصور

۶۔ اردو زبان کا مستقبل

۷۔ جنگ اور ادب

۸۔ ضمیمہ

۹۔ اردو ادب کے جدید رجحانات

جیسے مضامین اپنے تنوع اور نظریے کی پختگی کیلئے کافی معروف ہوئے۔ اسکے علاوہ ان کی کتاب ''سنگ میل'' کے مضامین بھی ہیں جنہوں اردو میں ترقی پسند تنقید کو مستحکم اور مقبول بنانے میں اہم کردار نبھائے۔

اردو میں ترقی پسند تنقید کے عہد بہ عہد ارتقا کے ضمن میں ایک اہم موڑ وہ ہے جب ایک بھری پری تحریک منظّم طور پر ہندستانی سماج اور ہندستانی ادبیات میں داخل ہوئی۔ جس نے تمام پرانے پیمانے توڑ

دئے۔سارے اقدار فرسودہ اور باطل قرار پائے۔اوراس کی جگہ اسی منظّم تحریک نے سماج اور ادیب کو یہ بتایا کہ اب تک آپ خواب کی جھوٹی پرفریب دنیا میں جی رہے تھے۔آب آنکھیں کھولئے اور نیا فلک اور نئی زمین دیکھئے۔اردو میں ترقی پسند تنقید کے نظریات نے آگے چل کر بہت وسعت اختیار کر لئے۔اس تحریک کے تشکیلی دور سے عہد حاضر تک ترقی پسند ناقدین ہر محاذ پر ڈٹے رہے۔انہیں بے شمار مخالفتوں سے دوچار ہونا پڑا۔پاکستان میں اس پر پابندی لگادی گئی۔ادبی نشستیں بند ہونے لگیں لیکن چونکہ اس تحریک کی بنیادیں عوام میں حد درجہ مضبوط تھیں اس لئے اس کے اثرات کم ہونے میں زیادہ وقت لگے۔اس تحریک کو اختر حسین رائے پوری نے شدومد کے ساتھ متعارف کرایا تو ضرور لیکن ان کے یہاں شدت اور جذباتیت کے عناصر نے مخالفین کی صفیں تیار کردیں۔اوراخیر میں وہ اس تحریک سے الگ بھی ہوگئے۔''حسین رائے پوری کے بعد سجاد ظہیر کا کارنامہ سب سے اہم ہے۔اس بابت گزشتہ سطور میں ذکر بھی کیا گیا ہے۔سجاد ظہیر کے یہاں شدت پسندی کی جگہ تعمیر اور خلوص کے پہلو زیادہ تھے حالانکہ وہ اس تحریک کے بنیاد گزار تھے۔انہوں نے منشور تیار کیا لیکن ان کے یہاں بعد میں آنے والے نقادوں کی طرح اشتعال انگیزی نہیں ہے۔ان کے نظریات بہت واضح اور دوٹوک تھے۔وہ انسان اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے متمنی تھے۔

سجاد ظہیر کے علاوہ اردو میں ترقی پسند تنقید اپنے اپنے طور ارتقائی مراحل طے کرانے والوں میں عبدالعلیم بھی ایک بہت ہی اہم نام ہے۔وہ بھی اس طرز تنقید کے بنیاد گزاروں میں اور مارکسزم کے سچے حامی تھے۔اور مارکسی نظریہ فکر کو ہی اصل میں زندگی کا نظریہ تصور کرتے تھے۔لیکن ان نظریات کے باوجود

وہ ادب پاروں میں فنی تقاضوں کو لازم قرار دیتے تھے۔ تنقید کے بنیادی مسائل پر اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے:

''ادبی تنقید کا مقصد یہ ہے کہ ادب کو پڑھنے والوں کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے۔ جو ادیب سنجیدہ پڑھنے والوں کو اپنا مخاطب بنانا چاہتا ہے اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ انسانی زندگی کی کشمکش کی تصویر کھینچے اور جہاں تک ممکن ہو پڑھنے والوں کے تجربات اور مشاغل سے لگاؤ پیدا کرے تا کہ انسانی ماحول کا مکمل خاکہ سامنے آسکے۔ ناقد کا فرض ہے کہ وہ ادبی کارناموں کو اسی معیار سے جانچے..... تنقید نہ صرف پڑھنے والوں کے لئے ضروری ہے بلکہ مصنف کیلئے بھی اہم ہے۔ ناقد کا یہ کام ہے کہ ادب کے میدان میں جو ترقی ہوئی اس کی کیفیت کو واضح کرے اور ادیبوں کے کارنامے سے علم انسانی میں جو اضافہ ہوا ہے اس کو مرتب طور پر پیش کرے۔ ناقد کے لئے ضروری ہے کہ وہ ادبی کارناموں کی تاریخی اہمیت کو واضح کرے ادیب کی دماغی صلاحیت کا معائنہ کرے ان عناصر کو جانچے جو ادیب نے استعمال کئے ہیں ادیب کے نقطہ نظر اور مقاصد سے بحث کرے۔''[1]

---

[1] ادبی تنقید کے بنیادی اصول۔ عبدالعلیم۔ ماہنامہ۔ نیا ادب۔ ص۔ ۹۶۔۹۵

پروفیسر عبدالعلیم کے ذریعے ان بنیادی نکات کو ذہن میں رکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ تنقید کا کام بہت ہی ذمہ داری اور ذی علمی کا ہے۔ اگر تنقید نگار اور بالخصوص ترقی پسند یا مارکسی تنقید نگار اس میں چوک گیا تو وہ نہ سماج کیلئے اچھا ہوگا اور نہ نقاد کیلئے۔ عبدالعلیم کے افکار ونظریات پر مزید گفتگو آئندہ کے باب میں ہوگی۔ یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ عبدالعلیم نے ترقی پسند تنقید کے ارتقا میں اپنے افکار ونظریات کے ذریعہ ایک ایسا کردار نبھایا جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اردو میں ترقی پسند تنقید کے ارتقا اور فروغ میں عبدالعلیم کے علاوہ مجنوں گورکھپوری، اعجاز حسین، فیض احمد فیض کے نام بھی کافی اہم ہیں۔ ان کے بعد اس طرز تنقید کو مزید وسعت اور بلندی دینے والوں میں پروفیسر احتشام حسین، علی سردار جعفری، ممتاز حسین، عزیز احمد، اختر انصاری، ظ۔ انصاری، آل احمد سرور، وقار عظیم، اختر اورینوی، شارب ردولوی، اسلوب احمد انصاری، عبادت بریلوی، محمد حسن، وحید اختر، قمر رئیس، محمد عقیل رضوی اور علی احمد فاطمی وغیرہ کا رناموں سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔

مختصراً یہ کہ اردو میں ترقی پسند تنقید تین ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا دور جیسا کہ عرض کیا گیا تشکیلی دور تھا۔ اس دور میں اختر حسین رائے پوری، سجاد ظہیر، اعجاز حسین اور مجنوں گورکھپوری وغیرہ تھے۔ ان ناقدین کی اس طرز تنقید کا اردو میں آغاز کیا۔ تنقید میں نئے مباحث کی ابتدا کی۔ ترقی پسند کی افہام وتفہیم کی اور فکری سطح پر وسعت اور تنوع کا ماحول سازگار کیا۔ ان ناقدین کا بڑا کام یہ تھا کہ انہوں نے تنقید جو ذاتی آرا اور پسند وناپسند تک محدود تھی اس کے Range میں اضافہ کرتے ہوئے اسے حد درجہ سائنٹفک منطقی

اور معروضی بنایا۔ ترقی پسند تحریک چونکہ روایتی ادب کے پرستاروں کے لئے بالکل عجیب وغریب بلکہ قابل اعتراض تھی اس لئے جب اس کی مخالفت شروع ہوئی تو ان ناقدین نے بہت سی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی بھی حتی المقدور کوششیں کیں۔ پہلے دور میں ترقی پسند تنقید جا بجا شدت، تکرار اور تضادات کا شکار بھی ہوئی لیکن چونکہ یہ اساسی دور تھا اس لئے مذکورہ ناقدین کے کارنامے کو کسی طور درگزر نہیں کیا جا سکتا۔

ترقی پسند تنقید کا دوسرا دور بہت ہی ہنگامہ خیز رہا۔ اسی دور کے اہم نقادوں میں احتشام حسین، علی سردار جعفری، عزیز احمد، ممتاز حسین، اختر انصاری، ظ۔ انصاری، سبط حسن اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ کے نام بہت اہم ہیں۔ اس دور میں ترقی پسند تنقید کا دائرہ بڑھا، اس کے اثرات بڑھے، فکری اور نظری طور پر اس کے حدود میں کئی دوسرے افکار بھی شامل ہو گئے۔ تاریخی، عمرانی، سماجی، سائنٹفک اور دیگر کئی ادبی زاویہ نظر نے اس کے دامن کو وسیع کیا۔ اصول وضوابط اور مختلف تنقیدی رویوں کی بابت کھل کر باتیں ہوئیں ان ناقدین میں دو نظریے کے ماننے والے لوگ موجود تھے۔ احتشام حسین، عزیز احمد، ممتاز حسین اور سبط حسن وغیرہ کے یہاں نظریے کی پیش کش کے دوران متوازن اور معتدل انداز ملتا ہے۔ لیکن ان کے برعکس اختر انصاری، علی سردار جعفری اور ظ۔ انصاری وغیرہ کے یہاں جا بجا شدت اور اشتعال کا شائبہ دکھائی دیتا ہے۔ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ موخر الذکر ناقدین نے کمیونزم کو اور اس کے اصول وضوابط کو اپنی شخصیت کا اٹوٹ حصہ بنا لیا تھا۔

ترقی پسند تنقید کا ارتقائی مرحلہ تیسرے دور میں داخل ہو کر جدید تنقیدی رجحانات ونظریات سے

متاثر نظر آتا ہے۔اس دور میں کوئی نئے رویے اور رجحانات منصۂ شہود بر آئے اور انہیں ناقدین نے پرکھا اور ان سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی تنقیدی تحریروں میں پیش کیا۔ان نئے تنقیدی رویے اور رجحان میں نفسیاتی تنقید، اسلوبیاتی تنقید، ساختیاتی تنقید، نئی تنقید(Neo Criticism) اور شکاگو تنقید کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ان تنقیدی نظریوں سے استفادہ کا ایک مثبت نتیجہ یہ نکلا کہ ترقی پسند تنقید جو چند بندھے ٹکے نکات کی تکرار پر مکتفی تھی اسے کھلی فضا اور متنوع رنگ و آہنگ میسر آئے۔دور ثالث کے نقاد ایک طرح سے جدید ترین تنقید کے بانی قرار پائے ء اور اردو تنقید جو کبھی تذکروں میں مقید تھی اسے بڑا اور وقیع میدان ملا۔فکر کے دریچے وا ہوئے۔ان نقادوں نے ایک اہم کام یہ کیا کہ نئے سرے سے تنقیدی سرمایے کا محاسبہ کرنا شروع کیا اور نئے افکار کو ان سے ہم آہنگ بھی کیا۔ان کے نزدیک ادب و فن کا تعلق ہر لمحہ تبدیل ہوتے ہوئے انسانی جذبات و احساسات کے فن کارانہ اظہار سے ہے۔اس لئے ان کے مطابق ادب کو جامد اصول اور سخت رویوں کی مدد سے دیکھنا مناسب نہیں بلکہ نئے افکار و نظریات اور عہد موجود کی آگہی و بصیرت رکھنا ترقی پسند نقادوں کیلئے ضروری قرار پایا۔یہی سبب ہے کہ ترقی پسند تنقید نگاروں کے جدید ترین طبقے کے یہاں بہت ہی گہرائی اور وسعت کا احساس ہوتا ہے۔اس سلسلے کے نقادوں میں عبارت بریلوی، آل احمد سرور، محمد حسن، وقار عظیم، اور محمد عقیل رضوی وغیرہ کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ان کے علاوہ پاکستان میں ہی محمد علی صدیقی، سلیم اختر، شہزاد منظر، اشفاق حسین اور آغا سہیل کی تنقیدات بھی کم اہمیت کی حامل نہیں۔ان ناقدین نے ترقی پسند تنقید کی توضیع اور توسیع پر خصوصی توجہ دی۔اس ضمن میں محمد

حسن اور محمد عقیل رضوی کے نظریات نے توازن اور اعتدال کے ساتھ ترقی پسند تنقید کو فروغ دیا۔ ان تینوں ادوار کی تنقیدی کاوشوں پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر مخمور صدری نے لکھا ہے کہ:

''اگر تینوں ادوار کے ترقی پسند نقادوں کی تنقیدی کاوشوں پر نظر ڈالتے ہیں تو خیال ونظر کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں۔ چنانچہ ان میں کسی کی تنقیدی تحریروں میں تاریخی آگہی اور روح عصر کا عنصر زیادہ نمایاں ہے تو کسی کے یہاں طبقاتی روابط، معاشرتی کشمکش اور مادی پہلو کا کسی نے نفسیاتی معلومات کو زیادہ اہمیت دی تو کسی کے یہاں افادیت ومقصدیت کا رجحان جاری ہوگیا۔ غرض کہ متنوع نقطۂ نظر مختلف خیالات ونظریات کی ہم آہنگی ہے جو مرکب ہوکر فن تنقید کا معیار بنی ہے۔ اس میں تاریخی، سماجی، مارکسی، عمرانی، نفسیاتی اور سائنٹی فک سبھی قسم کے تنقیدی رجحانات باہم متصل ہیں.....

اسی طرح ترقی پسند نقادوں میں بعض ایسے ناقدین ہیں جو شعر وادب کو معاشی ارتقا کا میکانکی طور پر پابند بنانا چاہتے ہیں بعض جدلیاتی مادیت کے خلاف ہیں اور شعر وادب سے کسی بھی سماجی ذمہ داری کی امید نہیں رکھتے اور بعض ایسے بھی ہیں جو شعر وادب کو تاریخی جبر کا ایک ایسا سماجی آلہ تصور کرتے ہیں جس کی مدد سے انسانی زندگی کو بہترین سے بہترین بنایا

جاسکتا ہے لیکن یہ سبھی نقاد اپنے منفرد ادبی شعور کے باوجود ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان ناقدوں نے اپنے ادبی شعور اور فنی احساس کے ذریعے شعر و ادب کی اصل روح کو پہچاننے اور فروغ دینے کی اپنے اپنے طور رپ پوری کوشش کی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان سبھی ترقی پسند ناقدین ادب کو ایک سی ناقدانہ حیثیت و عظمت نصیب نہیں ہوئی بلکہ فکر و شعور کی گہرائی اور ادبی خدمت کے اعتبار سے اردو کی ترقی پسند تنقید نگاری کی بساط پر ہر ایک کو الگ الگ مقام حاصل ہوا۔''[1]

یہ صحیح ہے کہ اردو ادب اپنی روایت اور ایک مستحکم تہذیب ہے اور یہ روایت اور تہذیب مشرقی اقدار پر منحصر کرتی ہے۔ لیکن اردو ادب کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے فی زمانہ نئے رجحانات اور نئے تجربات کا استقبال بھی کیا ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ آج اردو ادب کافی مقبول اور Relevent ہے۔ اردو میں جب مارکسی یا ترقی پسند تنقید کا ورود ہوا تو اس کا بھی استقبال کیا گیا۔ زندگی اور عام انسانوں کی فلاح و بہبود سے متعلق اس کے نظریات کی نہ صرف تائید ہوئی بلکہ عملی طور پر کوئی نئی فکر، نیا رجحان منظر عام پر آتا ہے تو مباحث کے در وا ہو جاتے ہیں۔ غور و فکر کرنے والے اذہان اس کے دور رس نتائج پر نظر رکھتے ہیں ساتھ ہی کچھ لوگ اس کے منفی پہلو کو اجاگر کر کے اس کی مخالفت میں صف آرا

---

[1] اردو میں ترقی پسند تنقید۔ ڈاکٹر مخمور صدری۔ ص۔ ۲۴۰۔۴۲۱

ہو جاتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس کے ردعمل میں حلقہ ارباب ذوق کی داغ بیل پڑی۔ اس کی جم کر مخالفت ہوئی۔ اختلافات کے سلسلے طویل ہوئے اور مارکسی نظریہ حیات کو باطل قرار دیا گیا اور اسے ادب کے حسن اور جمالیات کیلئے سم قاتل سمجھا گیا۔ ان مخالفین میں پروفیسر کلیم الدین احمد، رشید احمد صدیقی، خلیل الرحمٰن اعظمی، شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر عبدالمغنی، حامدی کاشمیری، احسن فاروقی اور محمد حسن عسکری جیسے نامور ناقدین کے نام آتے ہیں۔ مذکورہ تمام ناقدین بھی بہت معتبر اور باعلم تھے اور انہوں نے ترقی پسند تحریک کے منفی پہلوؤں کی نشاندہی کرنا اپنا ادبی فریضہ سمجھا۔ اس لئے انہیں بھی ناقابل اعتنا نہیں سمجھنا چاہئے۔

لیکن چونکہ ترقی پسند تحریک کا براہ راست تعلق عوام سے تھا مزدوروں اور محنت کشوں سے تھا اس لئے ہندستان کے استحصالی نظام میں اسے مقبول ہونے میں دیر نہ لگی۔ ترقی پسند ناقدین نے ترقی پسندی کی توضیح اور توسیع میں اہم کارنامہ انجام دیا۔ اس نظریے کے بنیادی نکات کو اپنے اپنے طور پر پیش کر کے مذکورہ ناقدین نے ایک ایسی فضا ہموار کی جس میں فرسودہ اور پامال خیالات اور کلیے کی جگہ حقیقت اور عقلیت کو جگہ ملی۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو کی نئی تنقید کے آغاز اور عہد بہ عہد ارتقا میں ترقی پسند تنقید نے مابہ الامتیاز کارنامے انجام دئے۔ اور اردو تنقید کو سائنٹفک منطقی اور معروضی بنایا۔ اسلئے اردو تنقید کی تاریخ ترقی پسند تنقید کے بغیر نامکمل اور ادھوری رہے گی۔ ☆

ترقی پسند نقاد

اردو میں ترقی پسند نقادوں سے پہلے حالؔی نے سب سے پہلے پرانی تنقیدی روش کو رد کیا اور تعمیری، بامعنی اور حقیقت پر مبنی تنقید پر زور دیا۔ ادب کی مختلف اصناف کے متعلق بنیادی نوعیت کے سوالات قائم کئے۔ حالؔی کے ان سوالوں نے اردو ادب میں پہلی دفعہ نئے سرے سے غور و فکر کی راہ ہموار کی۔ آگے چل کر ترقی پسند تحریک نے بھی ایسے ہی سوالات قائم کئے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ حالؔی نے یہ کام بغیر کسی منشور اور گائڈ لائن کے کیا اور ترقی پسند ناقدوں نے باضابطہ مارکسی نظریات کی روشنی میں ادب کو دیکھنے اور پرکھنے کا چلن عام کیا۔

مارکسی تنقید نے بالخصوص اس بات پر زور دیا کہ ادب سے زندگی کا تعلق گہرا ہونا چاہئے نیز اس کی افادیت (Utility) بھی مسلم ہونی چاہئے۔ ترقی پسند ناقدین کے مطابق وہ ادب یا فن پارہ کبھی اہم اور اعلیٰ نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ حقیقت کو نہ اپنائے اور اپنے اطراف کی ہو بہو عکاسی نہ کرے۔ ترقی پسند ناقدین نے اپنی تنقیدی تحریروں میں صاف طور پر اس بات کا اعادہ کیا کہ ادب کو تعمیری، بامعنی اور سماج کا سچا ترجمان اور محرک بنانے کے لئے اسے مارکسی نظریات کو قبول کرنا ہوگا کیونکہ یہی نظریہ معاشرے کو اور

ادب کو صحیح معنوں میں سچائی کے قریب کرتا ہے۔

ترقی پسند تنقید کے آغاز سے لے کر موجودہ عہد تک اس کے نظریات کی جھلکیاں مختلف نقادوں کی تحریروں میں بہ آسانی مل جاتی ہیں ان مارکسی نقادوں کے دو طبقے سامنے آئے۔ایک طبقہ شدت پسند تھا اور اس نے ادب کو اشتراکی نظریے کی تشہیر کا آرگن بنادیا اور ادب پاروں میں شور وغوغا ،نعرے بازی اور پروپگنڈہ در آیا اور ادب پارے اپنا حسن کھونے لگے۔اس زمرے کے بعض ناقدین اتنے متشدد ثابت ہوئے کہ انہوں نے قدما کے شاہکاروں کو بھی رد کرنا شروع کر دیا یہاں تک کہ ان کی زد میں میر تقی میر اور غالب جیسے شعرا بھی آ گئے۔حسرت موہانی نے اس شدت لگام لگانے کی کوشش کی لیکن طنطنہ کم نہ ہوا۔ نتیجتاً اختر حسین رائے پوری نے علامہ اقبال کو فاشسٹ تک قرار دے دیا گزشتہ سطور میں اختر حسین صاحب اور ان کی تصنیف ''ادب اور زندگی'' کے حوالے سے کئی باتیں ہو چکی ہیں۔

مذکورہ ناقدین کے برعکس معتدل اور متوازن خیال کے ناقدین کی بھی ایک بڑی تعداد نظر آتی ہے۔ جنہوں ں ے اس نظریے کو اپنایا تو ضرور لیکن اس طرح کہ تعمیری فضا بھی قائم ہو اور ادب کے بنیادی اوصاف بھی ختم نہ ہوں۔ان ناقدین میں مجنوں گورکھپوری، احتشام حسن، عزیز احمد اور کئی دوسرے نقادوں کے نام آتے ہیں۔ انہوں نے اعتدال کے ساتھ موجودہ ادب میں نئی جہتوں کو پیش کرنے کا کام کیا۔ انہوں نے متقدمین کے ادبی سرمایے کو رد نہیں کیا بلکہ ان کا نئے تناظر میں مطالعہ کیا اور ان کی عظمتوں کو اجاگر کیا۔انہی کی کوششوں سے نظیر اکبر آبادی جیسا عوامی اور سچا شاعر ادب کے نئے منظر نامے پر اپنی

عظمتوں کے ساتھ ابھرا۔ اور اردو کا پہلا عوامی شاعر کہلایا۔

مختصر یہ کہ ترقی پسند ناقدین کے دونوں طبقے اپنے اپنے طور پر نظریہ سازی اور عملی سرگرمیوں میں ایک عرصے تک محدود رہے اور اردو تنقید کو نئی جہات سے آشنا کرایا۔ اس باب میں انہیں ناقدین میں سے چند کی تحریروں کا مختصراً جائزہ پیش کیا جائے گا۔ تا کہ ان کے نظریات اور طرز تنقید کی بابت علم ہو سکے۔

اختر حسین رائے پوری:

اختر حسین رائے پوری ترقی پسند تنقید کے سب سے پہلے ناقدین کے طور پر اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ وہ مارکس کے نظریات کے حامی تھے۔ اور اس ضمن میں ان کا مضمون'' ادب اور زندگی'' رسالہ''اردو''۱۹۳۵) میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کی آواز دور دور تک سنی گئی۔ اختر حسین رائے پوری نے مذکورہ مضمون میں جن نکات پر سیر حاصل بحث کی تھی اور جو نتائج برآمد کئے تھے ان پر ادب کے ہر حلقے میں بحثیں ہوئیں۔ ''ادب اور زندگی'' کی مقبولیت سے مطمئن ہو کر انہوں نے اور بھی کئی مضامین تحریر کئے جو آگے چل کر کتابی شکل میں ۱۹۴۳ء میں منظر عام پر آئے۔ ان مضامین'' ادب اور زندگی'' کے علاوہ ''ادبی ترقی پسندی کا مفہوم'' اور''اردو ادب کے جدید رجحانات'' بھی کافی مقبول و معروف ہوئے۔

اختر حسین رائے پوری کی ایک اور کتاب''سنگ میل'' بی شائع ہوئی۔ گیارہ مضامین پر مشتمل اس کتاب کے مشمولات میں برہ راست ترقی پسندی یا ادب اور زندگی کے رشتوں کی بابت اظہار خیال نہیں ہے۔ لیکن ادب کے تئیں جو اختر حسین کا نظریہ تھا اسکا عکس اکثر جگہوں پر محسوس کر سکتے ہیں۔ وہ ایک

ساتھ شاعری، فکشن اور مغربی ادب پاروں پر گفتگو کر سکتے تھے۔ وہ اس لئے کہ ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ اور ذہن متنوع تھا۔ یہی سبب تھا کہ انہوں نے سب سے پلے ترقی پسندی کی ضرورت اور افادیت کو محسوس کیا اور ادب کے تعلق سے سب سے پہلے نہایت ہی بے باکی کے ساتھ اظہار خیال کیا۔ ان کا مضمون ''ادب اور زندگی'' ایک طرح سے طوفان تھا جس نے تمام ادبی ایوانوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ چونکہ شدت اور قطعیت کے ساتھ یہ خیالات پہلی دفعہ سامنے آئے تھے اس لئے اس پر اچھا خاصا بحث و مباحثہ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ترقی پسند تنقید کے بنیاد گزار کے طور پر ان کے اس کارنامے کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر شارب ردولوی رقم طراز ہیں:

> ''اردو کے مارکسی نقادوں میں پہلا نام اختر حسین رائے پوری کا ملتا ہے۔ جنہوں نے مارکس کے اقتصادی اور معاشی نظریات اور طبقاتی کشمکش کے تحت ادب کا مطلعہ کیا۔ مارکس نے ادبی، سماجی اور سیاسی ارتقا پر لکھا۔ ساتھ ہی اس نے بعض دوسرے محرکات کی اہمیت کا اعتراف بھی کیا تھا۔ اس کے نظریات کو ادب پر منطبق کرتے وقت صرف اقتصادی اور معاشی اثرات کو ہی اہمیت دی جس کی وجہ سے ان کے یہاں ایک قسم کا انتہا پسندانہ مارکسی نظریہ ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقیدوں میں ادبی اصولوں کی بجائے سماجی ضرورتوں پر زیادہ زور ملتا ہے۔ ظاہر ہے اس قسم کی

انتہا پسندی فنکارانہ حسن کو نظر انداز کر دیتی ہے۔ اور تخلیقی عمل کو خالص معاشی فریضہ بنا دیتی ہے۔"[1]

ڈاکٹر شارب ردولوی نے اختر حسین کے یہاں جس انتہا پسندی کی بات کی ہے وہ ان کی تحاریر میں اکثر مقامات پر موجود ہے۔ یہاں صرف ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے کہ جس سے اختر حسین کی شدت تحریر صاف ظاہر ہوتی ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

''تمام ہندستانی شعار زندگی سے کتنے بے خبر اور بے پروا تھے ان کے جذبات کتنے اوچھے اور بے حقیقت تھے اس کا اندازہ لگانے کیلئے چشم عبرت کی ضرورت ہے۔ ......۱۸۵۷ء کا سانحہ جو ہندستانی سماج کی بربادی کا پیش خیمہ تھا کتنے شاعروں نے اس خونچکاں واقعات کو نظم کیا، کتنے نوحے لکھے؟ کہاں تھے وہ رجز گو مرثیہ خواں جن کی جادو بیانی سے محرم کی ہر محفل ماتم کدہ بنجاتی تھی۔ کسی بڑے شاعر نے پلاسی کی لڑائی پر ایک بھی نوحہ لکھا؟ واقعات ۱۸۵۷ء داغ کا شہر آشوب اور غالب کے خطوط پڑھئے اور سر پیٹ لیجئے کہ جبپورے ملک کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا یہ حضرات اپنی روٹیوں کی سو کچھ نہ سوچتے تھے۔ اور سوچتے تھے تو ایسے بزدلنہ اور رجعت

---

[1] جدید اردو تنقید۔ اصول ونظریات۔ شارب ردولوی۔ ص۔ ۳۵۷

پسندانہ طریقوں سے جو زندگی اور شاعری کیلئے باعث ننگ ہیں۔''[1]

اختر حسین رائے پوری کے اس اقتباس اور اس طرح کے دوسرے بیانات سے اختلاف بھی ہوا اور اتفاق بھی۔ اتفاق اس طور پر کہ ان کی باتیں دل کو لگتی ہوئی تھیں اور اختلاف اس طرح ہوا کہ اختر شعرا سے جو چیز چاہتے تھے وہ اس معاشرے میں تھی ہی نہیں۔ ہمارے متقدمین کا عہد زیادہ تر سماجی شعور سے خالی تھا۔ شعرا شعری تقاضوں اور فنی سبقت کی فکر میں زیادہ مصروف تھے۔ حکومت وقت کے خلاف کھلے عام آواز اٹھانے کا چلن نہ تھا۔ اس لئے شعراء ان امور پر زیادہ غور نہ کر سکے جن کا ذکر رائے پوری صاحب نے کیا ہے۔

مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اختر حسین رائے اردو میں ترقی پسند تنقید کی بنیاد ڈال رہے تھے۔ ان کے نظریات تعمیری تھے اور ان کے یہاں خلوص نیتی تھی۔ لیکن متقدمین اور مشاہیر شعرا ادبا کے متعلق ان کی آرا زیادہ تر جارحانہ تھیں۔ اگر وہ مذکورہ شعرا کے ادوار اور ان کے سیاسی اور سماجی احوال پر غائر نظر ڈالتے تو اس طرح شاکی نہیں ہوتے جس طرح وہ اپنی تحریروں میں نظر آتے ہیں۔ بہر حال ان کی اولین ترقی پسند تنقیدی کاوشوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ گزشتہ سطور میں یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ اختر حسین صاحب کا ادبی موقف اشتراکی نظریے سے مماثل تھا۔ اس لئے وہ ادبی اور فنی نگارش کو اشتراکی نگاہ سے ہی دیکھتے تھے۔ ان کے نزدیک ادب کا مقصد دلبستگی اور تفریح نہیں بلکہ سماج کی سچی اور حقیقی عکاسی ہے۔ وہ ادب

---

[1] ادب اور انقلاب۔ اختر حسین رائے پوری۔ ص۔ ۶۲

کوسماج میں ایک بہت ہی اہم آرگن تسلیم کرتے تھے اس لئے اس آرگن کوسماج کا آرگن بنانا چاہتے تھے تا کہ ادب رجعت پسندوں سرمایہ داروں اور بورژوا طبقے کی مذمت کرے اور مجبور ومقہور طبقے کی حمایت پر کمر بستہ ہو۔ وہ معروف روسی ادیب ٹالسٹائی کے اس نظریے سے اتفاق کرتے ہیں کہ ادب اور آرٹ کا کام ہے کہ انسان کو متاثر کرے اس کے اندر ہلچل پیدا کرے اور وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہے لیکن اس طرح نہیں کہ وہ تعیش پسند ہو جائے بلکہ اس طرح کہ وہ بیداری ہو کر سامنے موجود تمام سماج دشمن عناصر سے برسر پیکار ہو۔ اختر صاحب کے مطابق ادیب چونکہ سماج کا ایک ذمہ دار فرد ہوتا ہے اس لئے اس کا یہ فرض ہے کہ وہی لکھے جس کی ضرورت معاشرے کو ہے۔ وہ ہمارے قدیم ادبی سرمایے کو میوزیم میں رکھنے اور انہیں قدیم ممیوں کی طرح سنبھال کر رکھنے کی صلاح اسی لئے دیتے ہیں کہ وہ آج کسی کام کے نہیں۔ اختر حسین نے اپنی بعض تحریروں میں انتہا پسندی کی تمام حدودں کو عبور کر لیا ہے۔ وہ ادب کو پوری طرح اشتراکی نظریے کا حامل بنانا چاہتے تھے۔ لیکن انہیں اپنے متن میں زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ان کے ہم عصروں اور بعد کے وقتوں میں آنے والے معتدل اور متوازن مزاج کے ترقی پسند ناقدین نے ان کی انتہا پسندی کے اثرات کو زائل کر دیا۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو ادب میں پہلی دفعہ ان کی تحریروں کے ذریعے بحث ومباحثہ کا در وا ہوا۔ اوادبا شعرا اور ناقدین کو نئے سرے سے ان امور پر غور وفکر کرنا پڑا جن پر اختر حسین رائے پوری نے زور دیا تھا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے نئی سوچ اور غور کرنے کیلئے طریقے سکھائے یا ان طریقوں کی طرف ناقدین اور دانش وروں کو راغب کیا اس لئے

ترقی پسند تنقید کی تاریخ میں ان کی اولین حیثیت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

سجاد ظہیر:

ہند و پاک میں ترقی پسند تحریک کے بنیاد گزاروں میں سجاد ظہیر اولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ وہ مارکسی نظرے کی حامی تھے اس لئے ان کے یہاں ناول، افسانے، نظمیں اور تنقیدی تحریریں اسی نظریے سے متاثر نظر آتی ہیں۔ بحیثیت نقاد ان کی کوئی باضابطہ تصنیف نہیں ہے۔ لیکن ان کی مشہور زمانہ تصنیفات ''روشنائی''، اور ''ذکر حافظ'' میں مارکسی نظریات کو بہت واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں سجاد ظہیر نے مارکس کی تھیوری اور جدلیاتی مادیت کو پورے طور پر اپنایا اور ادب کو طبقاتی کشمکش، سماجی حالات اور ادیب کے گرد و پیش کا ترجمان بنانا چاہا اور ملک کے طول و عرض میں سفر کر کے ان نظریات کو مقبول بنانے میں اہم کردار نبھایا۔ ان کے مطابق ادب کو انسان کی بہبود کے لئے تخلیق کرنا چاہئے اگر کوئی ادب پارہ ان اوصاف سے الگ ہے تو وہ کسی کام کا نہیں۔ یعنی جو ادب مظلوم انسانوں کی حمایت نہ کرے جو سماج اور انسانی تعلقات کو اہمیت نہ دے وہ افادی اور بامعنی ادب کے زمرے میں نہیں آ سکتا۔ اپنی تصنیف ''روشنائی'' میں اس بابت اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ

> ''ایک کامیاب فنکار حقائق واقعات سے مختلف انسانی رشتوں کے عمل اور ردعمل کی کیفیتوں، سماجی زندگی سے پیدا ہونے والے بہترین تصورات اور نظریوں کا مشاہدہ کر کے اور انہیں سمجھ کر اپنے دل و دماغ میں

جذب کرتا ہے یہ سچائیاں اس کے جذبات کا اسی قدر حصہ بن جاتی ہیں جتنا کہ اس کے ذہن کا، پھر اپنے جوش، جذبے، تخیل، بصیرت اور فنی مہارت کو کام میں لاکر وہ اپنے فن کی تخلیق کرتا ہے۔ اس طرح ایک نئی، خوشنما اور نشاط انگیز شے وجود میں آتی ہے۔''[1]

یعنی زندگی کو بہتر اور حسین بنانے میں ادب کا بہت اہم رول ہے۔ اس لئے ادب میں انسانی رشتوں کی حرمت کی موجودگی ضروری ہے۔ یہ خوبی ہماری زندگی اور ہماری فکر کو بلندی، بہتری اور انسانی دوستی کے قریب لے جاتی ہے۔ سجاد ظہیر کے یہاں فن کے تجزیے کے دوران یہی معیار پیش نظر ہوتے ہیں وہ دوسرے ترقی پسند ناقدین کی طرح شدت پسند نہیں ہیں اور نہ ہی قدما کی نگارشات اور فرسودہ اور سماج دشمن قرار دے کر رد کرتے ہیں ان کے یہاں اعتدال پسندی کا عمل ہر جگہ دکھائی دیتا ہے یہی سبب ہے کہ انہوں نے ذکر حافظ جیسی تصنیف میں قدیم ادب کو سراہا اور اس میں بھی سماجی تناظر کو نشان زد کیا۔ انہیں حافظ اس لئے پسند ہے کہ اس کے یہاں اپنا ذاتی غم نہیں ہے بلکہ وہ غم ہے جو معاشرے کا ہے۔ وہ مجبور انسان کو بھی وہی اہمیت دیتا ہے جو مقبول اشخاص کو دیتا ہے۔ ان کی تصنیف روشنائی میں ان کی تنقیدی بصیرت اور آگہی پورے طور پر منعکس ہوتی ہے۔ انہوں نے روشنائی میں بہت ہی تعمیری اور متوازن انداز اپناتے ہوئے منطقی اور سائنٹفک باتیں رکھی ہیں انہوں نے ترقی پسند تنقید اور ادب کے متعلق اظہار خیال

---

[1] روشنائی۔ سجاد ظہیر۔ ص۔۳۲

کیا ہے اور اردو ادب کو مارکسی دور سائنٹفک تنقید سے روشناس کرانے کا کام کیا ہے۔

اس ضمن میں ڈاکٹر شارب ردولوی رقم طراز ہیں:

''اردو تنقید میں ان (مارکسی) نظریات کو پیش کرنے والے یا ان نظریات کی بنیاد پر ادبی قدروں کا تعین کرنے والے کئی اہم ناقدین ہیں۔ لیکن ان نظریات کو افراط وتفریط اور انتہا پسندی سے الگ کر کے ادب کا مطالعہ کرنے والے ناقدین میں سجاد ظہیر کا نام سرفہرست ہے۔ انہوں نے مارکس اور لینن کے نظریات کے تحت اردو کے قدیم وجدید ادب کا مطالعہ کیا ان کی سب سے بڑی خصوصیت جو انہیں دوسرے مارکسی نقادوں سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ انہوں نے کوئی انتہا پسندانہ رویہ اختیار کرنے کے بجائے سائنٹفک طور پر ان کے نظریات کو ادب کے مطالعے کیلئے بنیاد بنایا۔ انہوں نے فنکار اور اسکے ماحول سے تعلق اور ادب پر پڑنے والے تاریخی وسماجی اثرات کا واضح الفاظ میں جائزہ لیتے ہوئے کہا تھا کہ

''(فنکار) کی تخلیق اسی روایت اور اسی ماحول سے پیدا ہوتی ہے جو انہیں ورثہ میں ملتے ہیں اور جن میں ان کی تعلیم وترتیب ہوتی ہے۔ وہ مسائل فنکاروں اور ادیبوں کو بھی درپیش ہوتے ہیں جو ایک خاص عہد یا

موقع پر کسی قوم کو خاص طور پر نوع انسانی کو عام طور پر پیش ہوتے ہیں۔
اگر کسی قوم کے ایک بڑے حصے میں بھوک، غریبی، افلاس، یا جہالت پھیلی ہو
یا اس قوم کو دوسری قوم کے کچھ لوگوں نے غلام بنالیا ہو۔ گر وہ قوم جاہلیت،
لوٹ، غارت گری کا شکار ہو ہو یا بڑے پیمانہ پر ہلاکت کا کوئی خطرہ درپیش
ہو تو ظاہر ہے اس قوم میں ادیبوں پر بھی ان کیفیات کا اثر پڑے گا اور ان
کے فن میں بھی اس کی جھلک ہوگی۔''[1]

سجاد ظہیر مارکسی نظریات کو ادب میں فروغ دینے کے ساتھ ایک بڑا کام یہ کیا کہ انتہا پسندوں کے ذریعے تحریک کے نظریات کے تئیں جو غلط فہمیاں پیدا ہوئی تھیں ان کو دور کیا۔ اور صحت مند طریقے سے اردو میں مارکسی نظریات کو منطبق کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ وہ واحد نقاد تھے جنہوں نے سماجی اور تہذیبی اقدار اور سیاسی اثرات اور مختلف طبقات کے مسائل اور ادب پر ان کے اثرات کو بہت ہی واضح اور مدلل انداز می پیش کیا کہ شعرا اور ادبا غیر ضروری نعرے بازی اور پروپگنڈہ سے باز آئیں اور تخریبی سرگرمیوں سے الگ وہ مساعی کریں جس سے ادب کا حسن اور وقار قائم رہے۔ کیونکہ اشتراکی ادیب و شاعر اور ناقدین کے ذریعے ترقی پسندی کے نام پر جو آپا دھاپی کا ماحول قائم ہو رہا تھا وہ ماحول ترقی پسندی سے عام لوگوں کو منحرف کرنے والا تھا۔ نیز یہ کہ وہ اصل ترقی پسندی بھی نہیں تھا۔ سجاد ظہیر نے ''اردو کی جدید انقلابی

---

[1] سجاد ظہیر کی تنقید نگاری۔ (تنقید مطالعے) شارب ردولوی۔ ص۔ ۶۳۔۶۲

شاعری'' جیسا مضمون لکھ کر اپنے موقف کو واضح کیا کہ اصل ترقی پسندی کیا ہے اور اسے کتنی کریہہ شکل میں پیش کیا جارہا ہے۔ سجاد ظہیر کا یہ مضمون تنقیدی بصیرت اور تعمیری وتخریبی تنقید اور نظریات کے بیچ بین فرق کو واضح کرتا ہے۔ پیش ہے مضمون کا درج ذیل حصہ:

'' ہمارے انقلابی شاعروں نے ایک حد تک سرمایہ داروں اور استعمار پسندون کی کھینچی ہوئی تصویر کو اپنالیا ہے جو وہ عوام کو انقلاب سے ڈرانے کیلئے کھینچتے رہتے ہیں۔ انقلاب کے اس خونیں تصور میں رومانیت جھلکتی ہے۔ یہ ایک طرح کی دہشت انگیزی ہے۔ یہ ایک ذہنی اور جذباتی بلوہ ہے جو ایک درمیانی طبقہ کے انقلاب پرست نوجوان کے لئے ابتدا میں تو شاید جائز ہوسکتا ہو لیکن اشتراکی شاعر کو اس سے دور رہنا چاہئے۔''[1]

سجاد ظہیر نے انقلاب کے اصل تصور کو واضح کیا جو بعض ترقی پسند شعرا کے یہاں بدلی ہوئی یعنی غلط شکل میں راہ پا گیا تھا۔

ادب کے بارے میں ترقی پسند نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں:

''ترقی پسندوں کے نزدیک ادب ایک فن لطیف ہے۔ زندگی کو زیادہ حسین، زیادہ معنی خیز بنانے کا وسیلہ ہے.....ترقی پسند ادیبوں کا

---

[1] اردو کی جدید انقلابی شاعری۔ سجاد ظہیر۔ نیا ادب۔ ۱۹۳۹ء۔

نقطہ نظر یہ ہے کہ ایک ادیب یا فنکار کا شعور اپنی قوم، اس کے مختلف طبقوں
کے کردار اور ان کے سامنے درپیش مسائل کے متعلق جس قدر گہرا ہوگا
حقیقت اور سچائی کا اسے جس قدر علم ہوگا اسی قدر زیادہ اسے فنی تخلیقات کو
بہتر بنانے کا موقع ملے گا۔''[1]

''روشنائی'' کے بعد سجاد ظہیر کی اہم ترین تصنیف ''ذکر حافظ'' ہے جسے سجاد ظہیر نے پاکستان کی جیل میں اسیری کے دوران مکمل کی۔ اس کتاب میں ظ۔ انصاری کے ذریعے سعدی اور حافظ کی غزلیہ شاعری پر کیے گئے اعتراضات کے جوابات بھی شامل ہیں یہ حصہ مضمون کی شکل میں سہ ماہی شاہراہ ۵۵۔۱۹۵۴ء میں بھی چھپا تھا۔ یہ ایک بہت ہی اہم تنقیدی کتاب ہے۔ سجاد ظہیر نے اس میں تنقید کے بنیادی اصولوں کو سامنے رکھ کر حافظ کی شاعری کا محاسبہ کیا ہے۔ یہاں بھی انکا ترقی پسند یعنی مارکسی نظریہ موجود ہے لیکن اس طرح کہ ماضی کی بھی اہمیت مسلم ہو جائے۔ سجاد ظہیر کا نظریہ ہے کہ پرانے شعرا کی تخلیقات کا تجزیہ ان کے دور کے مروجہ ماحول اور تاریخی و معاشرتی حالات کو سامنے رکھ کر کرنا چاہئے۔ ورنہ گمراہی پیدا ہوگی اگر آج کا ناقد پرانے ادب کو آج کے معیار اور روایت پر پرکھے گا تو ادب کے لئے ناانصافی ہوگی۔

متقدمین پر اعتراضات کرنے والوں میں کئی ایسے تھے جو مارکسی نظریے کی شدت سے مغلوب ہو کر اپنا توازن کھو رہے تھے۔ راجندر سنگھ بیدی نے میر کی شاعری کو فراری قرار دیا اور ان کے مطالعے کو بیکار

---

[1] ترقی پسند تحریک اور اس کے معترضین۔ سجاد ظہیر۔ حیات۔ جنوری۔ ۱۹۵۶۔ ص۔ ۹

گردانا۔ ہنس راج رہبر، مثنوی، ''زہر عشق'' کو جاگیردارانہ عہد کے زوال پذیر تمدن کا آئینہ اور عشق د رومان کی داستان کہا۔ ظ۔ انصاری نے حافظ کی شاعری پر درجہ ذیل الزامات عائد کئے۔

۱۔ حافظ نے علم وفلسفہ کی راہ ترک کرنے کی ترغیب دی ہے۔

۲۔ زاہد ومشائخ پر حافظ کا طنز استہزا ہے

۳۔ ان کے یہاں زندگی سے فرار کا عمل پایا جاتا ہے

۴۔ حافظ کے یہاں زندگی کا مقصد صرف عیش وعشرت اور سرمستی ہے۔

سجاد ظہیر نے دوسرے متعرضین کو تو برداشت کرلیا لیکن ظ۔ انصاری کی شدت آمیزی نا قابل برداشت تھی لہٰذا حافظ پر عائد کئے گئے ظ۔ انصاری کے الزامات کا تفصیل سے مدلل جواب رقم کیا جو انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ سے ستمبر ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا سجاد ظہیر نے ماضی کے ادب کا تجزیہ اور اس کے احتساب کے لئے جو ادبی معیار بنائے وہ یہاں ملاحظہ کریں:

> ''شاعر کے عقائد، اس کا فلسفہ، اس کا نظریہ حیات اپنے زمانے اور اپنی قوم کے عقائد، علم اور فلسفے سے مربوط ہوتا ہے پھر اس پر اپنے مخصوص طبقے اور اگروہ کی چھاپ بھی ہوتی ہے۔ اس کے لئے یہ تو ممکن ہے کہ اپنے عہد کے بہترین اور بلند ترین خیالات، احساسات وحقائق اور زندگی کے تعلقات اور رشتوں کا سچا اور موثر ترین اظہار کرے لیکن اس کے تخیل کی

سب سے اونچی پرواز بھی اس حد سے باہر نہیں ہوسکتی..... چنانچہ بہتر ہے کہ ہم جب دور وسطی کے کسی مفکر خاص طور سے کسی شاعر کی فکر کا تجزیہ کریں تو اس کے یہاں تصوف، اصلاحات اور صوفیانہ طرز خیال کو بھی دیکھ کر اس پر زندگی سے فرار کے نظریے کے پیرو یا رجعتی ہونے کا حکم نہ لگا دیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہم بالتفصیل اس کے کلام کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ آیا اس کا مجموعی تاثر منفی یا فراری ہے یا شاعر نے اپنے زمانے کے حقائق اور اس کے حسن وقبح کو اس طرح دیکھا اور سمجھا ہے جس سے ہمارے موجودہ شعور میں اضافہ ہوتا ہے اور ہماری تہذیب دماغ کے ذریعہ سے زندگی میں ہماری دلچسپی کو بڑھاتا ہے اور ہماری روح کو جہد حیات میں حصہ لینے کیلئے زیادہ متوازن اور مستعد کرتا ہے۔''[1]

درج بالا اقتباس سے سجاد ظہیر کی وسعت نظری اور بالغ نظری صاف طور پر واضح ہو جاتی ہے۔ ساتھ ہی بامعنی ترقی پسندی کی شبیہہ بھی صاف طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ ان کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مارکسی نظریات سے الگ بھی نہیں ہوتے اور ماضی کو رد بھی نہیں کرتے۔ وہ ماضی کو بھی عظیم سمجھتے ہیں۔ اور وہاں بھی فن کار کی مساعی کا احتساب کر کے ان کی عظمت کو ثابت کرتے ہیں۔

---

[1] ذکر حافظ۔ سجاد ظہیر۔ ص۔ ۲۱

سجاد ظہیر نے اپنی ایک تحریر ''اردو ہندی ہندستانی'' کے ذریعہ ایک بہت بڑے فتنے کو رام کرنے کی کوشش کی۔ یہ مضمون صرف لسانی باریکیوں کو ہی پیش نہیں کرتا بلکہ معاشرہ میں پھیلی ہوئی بہت سی غلط فہمیوں کا بھی ازالہ کرتا ہے۔ یہاں سجاد ظہیر کے تعمیری ذہن اور انکی سلجھی ہوئی سوچ صاف جھلکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس مضمون میں سجاد ظہیر نے ان دونوں زبانوں کے آغاز سے بحث کرتے ہوئے اس پر مرتب ہونے والے اثرات کا مدلل اور واضح جائزہ لیا ہے اور اردو ہندی تنازعے کے اصل اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے مطابق کھڑی بولی پر جہاں مسلم اثرات پڑ رہے تھے وہی دوسری طرف ہندو اثرات سے بھی یہ بولی متاثر ہو رہی تھی۔ اردو اور ہندی مناقشے کی اصل وجوہ کی بابت اظہار خیال کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''للولال جی کی ہندی دراصل اس اودھی اور برج بھاشا کے ادب کی ارتقائی شکل ہے جس کا غیر منقطع سلسلہ کبیر داس کے پہلے شورسینی اپ بھرنش آش میں لکھی ہوئی ویرگاتھاؤں پرتھی راج راسو وغیرہ سے اس کا سلسلہ ملتا ہے۔ یہ شمالی ہندستان میں ہندو تصورات ہندو روایات اور ہندو مذہبی اور تہذیبی رجحانات کا ایک لگاتار سلسلہ ہے جو مسلمانوں کے ہندستان میں آنے کے پہلے شورسینی پراکرت کی اپ بھرنش سے جا ملتا ہے۔ مسلمانوں کے ہندستان میں آنے سے اس تہذیبی دھارے پر گہرے اثر پڑے۔ اس میں تبدیلیاں ہوئیں پھر بھی وہ پوری آن بان کے ساتھ

جاری رہا۔''[1]

سجاد ظہیر کے اس اقتباس کا لب لباب یہ ہے کہ کھڑی بولی ہندی اور اردو کے بولنے والوں میں موجود تھی اور مقبول بھی تھی۔ اسی لئے ان دونوں زبانوں کی مشترکہ بنیاد کھڑی بولی ہی ہے۔ وقت کے ساتھ دونوں زبانوں میں تبدیلیاں واقع ہوئیں رنگ روپ نکھرے لیکن آج بھی یہ دونوں زبانیں ایک دوسرے سے حد درجہ قریب ہیں

مختصر یہ ہے کہ سجاد ظہیر نے سماج میں پیدا ہونے والی فرقہ واریت اور لسانی منافرت کو بھی دور کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ سجاد ظہیر کی تنقید نگاری پورے طور پر سماج اور معاشرے کو ہو بہو پیش کرنے کی سعی ہے۔ ساتھ ہی مارکسی نظریے کے ذریعے سماج میں موجود طبقاتی اور معاشی کشمکش کو دور کرنے اور مجبور و مظلوم طبقے کی بہبودی کیلئے وقف ہے۔

مجنوں گورکھپوری:

مجنوں گورکھپوری تاثراتی تنقید نگار کے طور پر جانے جاتے تھے۔ چونکہ انہیں فراق کی صحبت حاصل تھی اور فراق تاثراتی تنقید کے حامی تھے اس لئے ان کی ابتدا تنقید کے نمونے اسی دبستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن وہ تاثراتی اور جمالیاتی تنقید میں کوئی قابل قدر کارنامہ انجام نہ دے سکے لہٰذا جب ترقی پسند تحریک کا شہرہ ہوا تو وہ اس جانب متوجہ ہوئے۔ انہوں نے تحریک کی غرض و غایت اور اس کے نظریات

---

[1] اردو ہندی ہندستانی۔ سجاد ظہیر۔ کتب پبلشرز لمیٹڈ۔ بمبئی۔ ص۔ ۲۰

کا غائر مطالعہ کیا اور اس تحریک سے قریب تر ہو گئے۔ وہ رفتہ رفتہ ہی سہی مارکسی نظریات اور بالخصوص مادی جدلیت کے پیرو ہو گئے۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ انہوں نے میکانکی اور مصنوعی انداز نہیں اپنایا بلکہ اعتدال اور فنی حسن کاری کو اپناتے ہوئے انہوں نے اردو میں ترقی پسند تنقید کی توسیع کی۔ انہوں نے اپنے مضامین میں ادب اور زندگی کے بیچ کے تعلق کو واضح کیا۔ ان کا مجموعہ ''ادب اور زندگی'' ان کے نظریات کا آئینہ ہے۔ ان کے مطابق ادب اور آرٹ محض دل بستگی اور تفریح کی شے نہیں بلکہ یہ انسانی زندگی کا ایک اہم شعبہ ہے۔ چونکہ انسان کی زندگی خود ہمیشہ رواں دواں رہتی ہے اس لئے ادب کو ہر سطح پر متحرک، افادی اور تعمیری ہونا چاہئے۔ وہ حرکت پذیری پر اکثر زور دیتے ہیں۔ ان کے مطابق حرکت پذیری کا یہ عمل خلا کی پیداوار نہیں بلکہ طبقاتی سماج کی کشمکش اس عہد کا معاشی اور معاشرتی ماحول ادب کے تغیر پذیری کی سمت مقرر کرتا ہے۔ وہ اپنی تصنیف ''ادب اور زندگی'' میں لکھتے ہیں:

> ''ادیب کوئی راہب اور جوگی نہں ہوتا اور ادب کوئی ترک و تپسیا کی پیداوار نہیں ہے۔ ادیب بھی اسی طرح ایک مخصوص ہیئت اجتماعی، ایک خاص نظام تمدن کا پروردہ ہوتا ہے جس طرح کہ کوئی دوسرا فرد اور ادب بھی براہ راست ہماری معاشی اور سماجی زندگی سے اسی طرح متاثر ہے جس طرح ہمارے دسرے حرکات وسکنات ادیب کو خلاق کہا گیا ہے۔ لیکن اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ وہ قادر مطلق کی طرح صرف 'کن' سے جو چاہے اور جس وقت

چاہے بنا سکتا ہے۔ شاعر جو کچھ کہتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک
اندرونی اپج سے مجبو ہوکر کہتا ہے۔ جو بظاہر انفرادی چیز معلوم ہوتی ہے۔
لیکن دراصل یہ اپج ان تمام خارجی حالات واسباب کا نتیجہ ہوتی ہیں جس کو
مجموعی طور پر ہیئت اجتماعی کہتے ہیں۔''[1]

محولہ بالا اقتباس میں مجنوں گورکھپوری نے ادیب اور شاعر کے احساسات و جذبات کو بظاہر ذاتی کوائف کا اظہار یہ تصور کیا ہے لیکن بباطن اس کا تعلق سماجی سروکار سے ہوتا ہے۔ اگر اس کا تعلق ہمارے سماج، اقتصادیات اور طبقاتی سچوئشن سے نہیں ہے تو اس کی اہمیت اور معنویت محدود ہوکر رہ جاتی ہے۔

مجنوں گورکھپوری کے تنقیدی مضامین کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ابتدا میں جمالیاتی یا تاثراتی تنقید سے متاثر تھے لیکن بعد میں وہ مارکسی تنقید سے قریب ہوگئے وہ عملی تنقید میں بھی اسی طرح تنقید کو اپناتے ہیں لیکن ان کے یہاں دوسروں کی طرح انتہا پسندی نہیں ہے ان کے یہاں جدلیاتی مادیت کے نظریے کے ساتھ فنی حسن اور جمالیاتی حس کا بھی سراغ ملتا ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں کلاسیکی ادبی ورثے کو اتنی ہی اہمیت دیتے ہیں جتنی نئے ادب اور نئے افکار کو دیتے ہیں ادب ان کے لئے ایک ایسا آئینہ ہے جس میں مستقبل حال اور ماضی سب جھلکتے ہیں۔ وہ واقعیت تخیلیت، افادیت اور جمالیات کو ایک آہنگ اور اجتماعی وانفرادی نوعیت کے ساتھ دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ انہوں نے مارکسی نظریات سے ادب اور

---

[1] ادب اور زندگی۔ مجنوں گورکھپوری۔ ۱۹۸۴۔ ص۔ ۴۸

زندگی کے تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے ادیب اور ادب کی سماجی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ مارکس کے جدلیاتی مادیت کے تحت فنی تخلیق کو پرکھتے ہیں۔ اور ادب کو وہ زندگی کا ترجمان ہی نہیں بلکہ زندگی کا ناقد بھی تصور کرتے ہیں۔ ملاحظہ کریں یہ اقتباس:

''ادب بھی زندگی کا ایک شعبہ ہے اور زندگی نام ہے ایک جدلیاتی حرکت کا جس کے ہمیشہ دو متضاد پہلو ہوتے ہیں۔ ادب بھی ایک جدلیاتی حرکت ہے اور اس کے دو متضاد رخ ہیں۔ ایک تو خارجی یا عملی یا افادی۔ دوسرا داخلی یا تخیلی یا جمالیاتی وحسن کاری یا ادیب کا کام یہ ہے کہ وہ ان بظاہر متضاد میلانات کے درمیان توازن اور ہم آہنگی قائم کئے رہے ورنہ اس میں جہاں ایک پلہ بھاری ہوا وہیں فساد وانتشار پیدا ہونے لگے گا۔ مارکس نے جو کچھ کہا تھا اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ادیب کو زمانے کے پیچھے نہ ہونا چاہئے۔ لیکن اس کے معنی ہرگز نہ تھے کہ ادیب زمانے کا غلام ہے۔ ادب حال کا آئینہ ضرور ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ مستقبل کا اشاریہ بھی ہوتا ہے اور اس کے لئے بیک وقت واقعیت اور تخیلیت افادیت اور جمالیت، اجتماعیت اور انفرادیت سب کی ضرورت ہے۔''[1]

---

[1] جدید اردو تنقید۔ اصول ونظریات۔ شارب ردولوی۔ ص۔ ۳۶۵

مجنوں گورکھپوری کا اختصاص یہ ہے کہ وہ دوسرے ترقی پسندوں کی طرح صرف اجتماعیت پر اور عومی موضوعات ومسائل پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ انکے یہاں انفرادی جذبات واحساسات کی باریکیوں پر بھی زور ہے۔ مجنوں گورکھپوری شاید ترقی پسند ناقدین میں پہلے ناقد ہیں جو انفرادیت کو نظر انداز نہیں کرتے اجتماعیت اور انفرادیت کے ضمن میں ان کا موقف ہے کہ مارکسی تنقید میں ایک بڑا مسئلہ اجتماعیت اور انفرادیت کے بیچ فرق سے بھی پیدا ہوتا ہے۔ ادب بلا شک وشبہ اجتماعی شعور کا حصہ ہوتا ہے.....سماج اور معاشرے کے تال میل سے ہمارا ادب دن بہ دن جمہوری اور اجتماعی ہوتا جاتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ادب کو اجتماعی ہونا ضروری ہے اور وہ ادب کسی مصرف کا نہیں جو اجتماعیت کا ترجمان نہ ہو۔ ان کے مطابق کسی بھی ادب کی تخلیق ہی انسان کے نجی ارادوں کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ اور افراد اپنے اپنے طور پر اپنے مخصوص ماحول اور اپنی ذات کے دائروں کو ضرور منعکس کرتے ہیں۔ ادبا شعرا ماضی اور حال کی نسبت سے مجبور تو ہوتے ہیں لیکن مستقبل کے لحاظ سے وہ آزاد ہوتے ہیں۔ ان کے مطابق ادیب کی انفرادیت کا ایک پیمانہ نہ صرف جائز ہے بلکہ لازمی بھی ہے۔ اس ضمن میں وہ اس بات کی تنبیہ بھی کرتے ہیں کہ انفرادیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہونا چاہئے کہ وہ اپنے تجربے کرنے لگے جو قابل قبول نہ ہوں اور صرف اسی تک محدود ہو کر رہ جائے۔ مجنوں گورکھپوری اپنی بیشتر تنقیدی تحریروں میں ایک متوازن رویہ اپناتے ہیں وہ یہ باور کراتے ہیں کہ ادب کی افہام وتفہیم کا صرف ایک بندھا ٹکا فارمولا قابل قبول نہیں۔ بلکہ اس کے دوسرے ذرائع بھی ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب ''ادب اور زندگی'' میں ادب کے

جدلیاتی پہلو سے بحث کرنے کے ساتھ اس کے سماجی سروکار پر بھی گہری نگاہ رکھنے پر زور دیا ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے مواد اور ہیئت و اسلوب کے بیچ اعتدال اور ہم آہنگی کو بھی لازمی قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ مارکسی نقادوں کے یک رخے رویے کی طرف توجہ مبذول کراتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے یہاں یہ رویہ کسی نتیجے پر پہنچنے نہیں دیتا۔ وہ رقم طراز ہیں:

''تمہارے ادیب اسلوب کو کچھ غیر اہم سمجھنے لگے ہیں وہ مواد کو اسلوب سے الگ کر کے اس پر زور دیتے ہیں جو فعل عبث ہے۔ بے اسلوبی جدید ادب کی ایک مستقل شان ہوگئی ہے ہمارے نئے ادیبوں (مارکسی ادیبوں) کو اس راز سے آگاہ رہنا چاہئے کہ مواد و اسلوب لازم و ملزوم ہے اور زندہ ادب میں ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اسلوب کوئی باہری چیز نہیں ہے بلکہ مواد کے ساتھ اس کے اندرونی ترکیب میں داخل ہے اور ادب میں زندگی و بالیدگی پیدا کرتا ہے۔ اسلوب سے مواد میں جان آتی ہے۔ ہر قوت اظہار کے بعد حقیقت ہوتی اور اظہار کے معنی یہ ہیں کہ مخصوص موزوں صورت اختیار کی جائے پرانے اسالیب کی غلامانہ تقلید تو یقیناً ہمارے فن میں موت کا حکم رکھتی ہے۔ فکر اور اسلوب ایک راگ کے دو سُر ہیں۔ جن کے مل کر ایک ہو جانے سے ہی راگ پیدا ہو سکتا ہے اور جن کے بغیر راگ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔''[1]

گزشتہ سطور میں عرض کیا جا چکا ہے کہ مجنوں گورکھپوری ادب میں مقصد اور نظریے کے وجوب

---

[1] ادب اور زندگی۔ مجنوں گورکھپوری۔ ص ۱۶۳۔۱۶۲

کے ساتھ جمالیات اور فنی حسن کو بھی اہم قرار دیتے ہیں۔اس لئے کہ اگر کسی بھی نظرے یا مقصد کو فن کارانہ حسن کے ساتھ نہیں پیش کیا جائے تو وہ بے اثر ہو جاتا ہے۔اور خالص مقصدی ادب تو صرف نعرہ اور شور وشغب ہی بن کر رہ جاتا ہے۔یہی سبب ہے کہ انہوں نے اردو کے قدیم ادبی ورثے کا غائر مطالعہ کیا اور اردو کے کلاسیکی ادب سے آشنائی پیدا کی۔ماضی کو حال کے لئے بہت ضروری شے تصور کیا۔وہ ماضی کو رد کرنے والے انتہا پسند ناقدین سے اختلاف کرتے ہیں۔اور ادب کو ماضی سے جڑے رہنے کو اس کی بقا کا ضامن قرار دیتے ہیں۔

مجنوں گورکھپوری کے یہاں عملی تنقید کے بھی عمدہ نمونے موجود ہیں مثلاً میر اور ہم، دیوان غالب اور اردو غزل، حالی کا مرتبہ اردو ادب میں مہدی حسن افادی، فانی بدایونی، حسرت کی غزل، نظیر اکبر الہ آبادی اور عصمت چغتائی جیسے مضامین عملی تنقید کی بہترین مثالیں ہیں۔ان مضامین میں ہر جگہ مارکسی نظریہ کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔لیکن فن کار کے یہاں فنی محاسن کی تلاش بھی جھلکتی ہے۔

ان کے مذکورہ مضامین کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر مخمور صدری نے لکھا ہے:

> ''عملی تنقید کے ضمن میں ''میر اور ہم'' کے عنوان سے جو مضمون مجنوں گورکھپوری نے لکھا ہے اس میں بھی انہوں نے سب سے پہلے اس زمانے اور ماحول کی بات کی جس میں میر نے آنکھیں کھولیں.....ان کے سامنے اجڑی ہوئی دلی تھی۔یہ وہ حالات تھے جس نے میر کو میر بنایا اور میر کو ماحول

کے اسی تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح نظیر اکبر آبادی کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ نظیر اردو شعرا میں وہ پہلا شاعر تھا جو براہ راست عوام سے مخاطب ہوتا ہے اور جس کے اشعار میں عام لوگوں کے جذبات واحساسات کی عکاسی ملتی ہے۔ اسی طرح ''ادب اور زندگی''، ''زندگی اور پرانی قدریں'' وغیر نظریاتی تنقید کے اعتبار سے اہم ہیں۔''[1]

لہٰذا مجنوں گورکھپوری کی تنقید نگاری کے متعلق مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے معتدل اور متوازن طرز تنقید نے ادب کے سنجیدہ اور غور وفکر کرنے والے طبقوں کو متاثر کیا اور انہیں اردو کی ترقی پسند تنقید میں ایک اہم مقام حاصل ہوا۔ ساتھ ہی اردو کی ترقی پسند تنقید کے بانیوں میں بھی ان کا نام روشن ہے۔ اس اعتبار سے مجنوں گورکھپوری کی ادبی حیثیت سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

احتشام حسین:

احتشام حسین کی شخصیت کے یوں تو کئی پہلو تھے لیکن بطور نقاد وہ سب سے زیادہ معروف ہوئے۔ احتشام حسین نے ترقی پسند نظریات کو اپنایا اور اس میدان کے اہم ترین ناقدین میں شمار کئے جانے لگے۔ اردو میں مارکسی تنقید کا دبستان انہوں نے ہی متعارف کرایا۔ ان کے یہاں اختر حسین رائے پوری کی طرح انتہا پسندی نہ تھی۔ بلکہ انہوں نے اس انتہا پسندی کو ختم کر کے اعتدال اور توازن کی راہ ہموار کی۔

---

[1] اردو میں ترقی پسند تنقید۔ مخمور صدری۔ ص۔ ۲۴۱

ترقی پسند تحریک کے متعلق عام ذہن یہ تھا کہ یہ ایک شدت پسند اور فنی حسن سے بیگانہ تحریک ہے۔ احتشام حسین نے اس غلط فہمی کو اپنی تحریروں کے ذریعے دور کرنے کی حتی الامکان کوشش کی۔

ان کی مساعی کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر سلمان اطہر جاوید نے لکھا ہے کہ:

''یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ ترقی پسند تحریک میں کئی ایسے ادیب، شاعر اور نقاد شامل تھے جو کمیونسٹ نہیں تھے۔ لیکن ترقی پسند تحریک کے ساتھ اس لئے رہے کہ اس کی وساطت سے ایک ایسا نظریہ ملا جو زندگی دوست تھا جس نے شعر و ادب کو حکمرانوں کی قلم روی سے نکال کر عوام کے دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ کر دیا۔ کمیونزم سے اپنی دلچسپی کے باوجود احتشام حسین نے ترقی پسند تحریک کے اس تصور کو اردو میں عام کرنے میں جس خوش اسلوبی اور شائستگی کا مظاہرہ کیا وہ ان کی اپنی خصوصیات رہی ہیں احتشام حسین ترقی پسند تحریک کے موید نہیں مجاہد بھی رہے۔''[1]

گرچہ احتشام حسین کے یہاں لچک پیدا ہوگئی تھی لیکن وہ بنیادی طور پر مارکسی نقاد ہی تھے اور انہوں نے مارکسی نظریات کے بنیادی نکات کو ہمہ وقت پیش نظر رکھا۔ اور یہ کوشش کی کہ جو کچھ کہا جائے عقلی اور منطقی طور پر کمزور نہ ہو بلکہ انہیں عقل سلیم بہ آسانی تسلیم کر لے۔ ان کا موقف تھا کہ ادب زندگی کا ہی

---

[1] ادب میں ابہام۔ ڈاکٹر سلمان اطہر جاوید۔ مطبوعہ نیشنل بکڈپو حیدرآباد۔ ۱۹۷۴۔ ص۔ ۲۲۵

پرتو ہے۔ اس لئے ادیب کا مقصد اور اس کا نظریہ واضح ہونا چاہئے۔ فن بغیر مقصد کے نہیں ہوسکتا لیکن حد سے زیادہ مقصدیت ادب کو بے وقعت اور مضحکہ خیز بنا دیتی ہے۔ معتدل مقصدیت کے ذریعہ لطف اور مسرت کی کیفیت کے ساتھ افادیت کو بھی پیش نظر رکھنا لازمی ہے۔ احتشام حسین اپنی دلیلوں سے یہ واضح کرتے ہیں کہ قدیم ادب کو، رد نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ ماضی کے ادبی سرمایے کا جائزہ لے کر اس کے پس منظر کی افہام و تفہیم کرنی چاہئے۔ اور اس کیلئے ضروری ہے کہ قدیم ادبی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں قدیم ترین تاریخ و تہذیب سے بحث کی ہے اور اپنی فکر کا رشتہ ایک ساتھ تاریخ اور موجودہ عہد سے استوار رکھا۔ اس ضمن میں وہ فرماتے ہیں کہ:

''ایک ایسے دور میں جو نعروں سے مرعوب ہو رہا تھا اور سوشلسٹ حقیقت نگاری کے نام پر جو میکانکی انقلاب اختیار کیا گیا تھا، وہ مضحکہ خیز حد تک سطحی ہو چکا تھا، احتشام حسین کی تنقیدیں سنجیدہ علمی لب و لہجہ کی ضمانت تھیں۔ انہوں نے ماضی کے تجزیے کو احترام دیا۔ پوری تاریخ کو محض جاگیر داری کی بے راہ روی قرار دے کر ردی کی ٹوکری میں نہیں ڈالا۔ اس کے آئینے میں بھی ابھرتی مٹتی، ٹکرائی اور دبتی آرزوؤں اور طبقاتی کشمکش کو دیکھا اور سمجھا۔ یہ کام محض فارمولوں سے نہیں ہوسکتا۔ اس کے لئے تاریخ کے سنجیدہ مطالعے اور گہری تجزیاتی نظر کی ضرورت تھی۔ یہ انداز نظر احمد علی اور

اختر حسین رائے پوری کی تحریروں سے مختلف تھا۔ اس میں گرمی کم تھی روشنی
زیادہ کیونکہ اس کی بنیاد جوش پر نہیں عقلی استدلال پر تھی۔''[1]

احتشام حسین نے چونکہ عام ترقی پسندوں سے الگ ایک راہ بنائی تھی اس لئے اکثر متشدد ترقی پسند ناقدین نے ان پر اعتراضات کئے۔ معترضین نے آگے چل کر انکے نظریے اور افکار کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ ان معترضین میں پرانے بھی تھے اور نئے نقاد اور ادیب بھی شامل تھے۔ ان پر اعتراضات کا لب لباب یہ تھا کہ جب وہ تنقید کے اصول وضع کرتے ہیں تو مارکسی نظریات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور جب مارکسی نظریات کی بات کرتے ہیں تو ان کے اصول دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ یعنی وہ مصلحت کا شکار تھے۔ اور مارکسی نظریات کے تحت وہ اپنے اصول نقد میں اور ادب پاروں کے تجزیے میں توازن کھو بیٹھے۔

اس بابت وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر شمیمہ بیگم نے لکھا ہے کہ:

'' یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ احتشام حسین نے کبھی مارکس کے پورے
نظریات مان لینے کا اعلان نہیں کیا۔ وہ جدلیاتی مادیت کے قائل تھے۔ مگر
عقیدہ اس سے مستثنیٰ تھا جس کا اعلان خود سجاد ظہیر نے متعدد مقامات پر کیا
اب رہ گئیں رومانیت جمالیات اور جنسیات تو مارکس خود ان کا قائل تھا۔
اور بفرض یہ مان لیا جائے کہ مارکسیت میں ان کی اجازت نہیں تو ہندستان

---

[1] شناسا چہرے۔ ڈاکٹر محمد حسن۔ مطبوعہ ایجوکیشنل بک ہاؤس علیگڑھ۔ ۱۹۷۹۔ ص۔ ۱۵۵

کی ترقی پسند تحریک نے سماجی نظریوں کے ذیل میں ان سب کو مانا تھا اور احتشام حسین نے متعدد بار اس کا اعلان کیا تھا تاہم رومانیت کو رومانی نظریے کی طرح اور جمالیات کو جمالیاتی نقطہ نظر سے اور جنسیات کے لئے فرائیڈ کی قیادت کو احتشام حسین نے تسلیم نہیں کیا۔ انکے یہاں سب چیزیں حد اعتدال پر تھیں۔ وہ جب کبھی بات کرتے تھے تو مارکس کے ادبی نظریات پر سیاسیات سے ان کا کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔''[1]

درج بالا اقتباس سے احتشام حسین کی اعتدال پسندی اور انفرادی سوچ ظاہر ہوتی ہے اور یہ واضح ہوتا ہے کہ ہو بہو مارکسی نظریات کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں تھے۔ وہ تاریخ کے تناظر میں وقت اور ماحول کے پیش نظر ان میں تغیر و تبدل کے حامی تھے۔ یہ خوبی انہیں دوسرے کئی انتہا پسند ترقی پسند ناقدوں سے ممتاز اور ممیّز کرتی ہے۔

احتشام حسین پر اکثر نقادوں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ وہ کم مرتبہ شاعروں اور اعلیٰ مرتبہ شاعروں کا ذکر ایک ساتھ کرتے ہیں۔ یعنی نئی نسل کے ان شعرا ادبا پر بھی اظہار خیال کرتے ہیں جو ابھی کسی مقام پر پہنچے نہیں ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ احتشام حسین نے کسی ایسے نئے شاعر کو موضوع گفتگو نہیں بنایا ہے جس کی کوئی شناخت نہ ہو۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہمت افزائی کے طور پر چند ابھرتے ہوئے شعرا کا ذکر ضرور کیا

---

[1] ترقی پسند تنقید کا ارتقا اور احتشام حسین۔ ڈاکٹر شمیمہ بیگم۔ اردو اکیڈمی سندھ کراچی۔ ۱۹۸۷ء ص۔ ۵۸۳

ہے۔لیکن یہ ابھرتے ہوئے شعرا بھی بہت معروف نہیں تو بے وقعت بھی نہیں ہیں۔ احتشام حسین نے متعدد مقامات پر یہ ظاہر کیا ہے کہ جس نئے ادیب اور شاعر کے یہاں جوہر قابل موجود ہے۔اس کی حوصلہ افزائی کرنا ادبی دیانت داری ہے۔اگر ان کے ساتھ انصاف نہ ہوا تو وہ مایوسی کا شکار ہو جائیں گے۔اور ان کے اندر بیشتر ادبی خصوصیات ختم ہو جائیں گی۔اور پھر آگے چل کر پرانے لکھنے والے ادیبوں شاعروں کے ذریعے خالی کی گئی جگہیں پر کرنے والا کوئی نہ رہے گا۔ احتشام حسین نے بحیثیت ایک دور رس اور دور بین نگاہ نقاد کی طرح اس ضرورت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ آئندہ نسل کو ادب کی باگ ڈور سنبھالنا ہے۔شاید یہی سبب ہے کہ ان کے بعد ان کے پیروکاروں کی ایک بڑی تعداد آج بھی موجود ہے اور ان کی خوبیوں کی معترف ہے۔

احتشام حسین کے معترضین میں سب سے بڑا نام پروفیسر کلیم الدین احمد کا ہے۔ وہ اپنے اعتراضات کا سلسلہ ترقی پسند نظریات کی تردید کے ساتھ احتشام کی تنقیدات تک لے جاتے ہیں۔کلیم الدین احمد ترقی پسند نظریے کو باطل اور بے معنی ٹھہراتے ہوئے اسے غور وفکر سے خالی قرار دیتے ہیں وہ براہ راست احتشام حسین کو ہدف بناتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ کوئی اہم ناقد نہیں ہیں۔ وہ مارکسی ہیں لیکن ان کی تنقید میں مارکسی نظریات کی دھجیاں نظر آتی ہیں۔آگے چل کر پروفیسر عبدالمغنی نے بھی اسی طرح کے جملے احتشام حسین کے تعلق سے لکھے۔لیکن احتشام حسین نے ترکی بہ ترکی جوب دینے کی روش اختیار نہیں۔ وہ خاموش طبع انسان تھے۔اس لئے ان کی حمایت میں دوسرے کئی نقادوں نے مورچہ سنبھالا۔ احتشام حسین ذاتی

طور پر ادب میں چھینٹا کشی کو مذموم قرار دیتے ہیں۔

اس ضمن میں ڈاکٹر شمیمہ بیگم نے وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''بلاشبہ احتشام حسین پر کلیم الدین احمد کے اعتراضات کا جواب اگر احتشام حسین کی طرف سے دیا جاتا تو اس کا انداز کچھ اور ہوتا لیکن اس کی ضرورت اس لئے محسوس نہیں کی گئی کہ احتشام حسین کے مضامین میں پہلے سے ایسے جوابات موجود ہیں۔ پھر کلیم الدین احمد کی رائے زنی میں کوئی باقاعدگی پائی نہیں جاتی کہ دفعہ وار بحث ہوسکتی۔ یوں مجموعی طور پر کلیم الدین احمد کی نظر محاسن کی طرف بہت کم جاتی ہے۔ عموماً عیب ہی کی جویا رہتی ہے جو کوئی زیادہ بڑی بات نہیں ہے۔ اس سے اصلاح کا پہلو پیدا ہوتا ہے لیکن اگر ان کے طرز تحریر میں تمسخر پیدا ہو جائے تو اشتعال، اصلاح کی جگہ لے لیتا ہے۔ ایسا ہی کچھ احتشام حسین کے ساتھ پیش آیا اور ان کو اسی لہجے میں جواب ملا جو ہماری تہذیبی روایت کے خلاف ہے۔ نظریاتی اعتبار سے کلیم الدین احمد ترقی پسند ادبی تحریک کے خلاف ہیں ترقی پسند شاعروں پر تنقید کرتے وقت بھی کسی شاعر میں انہیں کوئی اچھی بات نظر نہیں آتی۔ بعینہ یہی صورت حال ادب و تنقید کی بھی ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور

مجنوں گورکھپوری کے لئے بھی انہوں ں ے کچھ اچھا رویہ اختیار نہیں کیا

اور احتشام حسین کے معاملے میں تو حد سے بڑھ گئے۔''[1]

احتشام حسین پر اعتراض سے قطع نظر انکے تعمیری اور پرخلوص رویے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ احتشام حسین فن اور فنکار کی عظمت کے متلاشی ہیں۔ وہ اپنے نظریات کی وضاحت کے دوران اکثر ان ادب پاروں کی اہمیت اور عظمت کے قائل نظر آتے ہیں جو انسانی اقدار کو عظمت اور سماج کو معنویت عطا کرتے ہیں۔ وہ تخلیق کو تفریح اور دل بستگی کا ذریعہ نہیں مانتے۔ وہ اس رجحان کو تسلیم نہیں کرتے کہ فن پاروں کے ذریعے لفظی بازی گری اور بے معنی صورت گری کی راہ اپنائی جائے۔ ایسا نہیں کہ وہ ادب میں بہترین اور دلکش اسلوب کے منکر ہیں لیکن وہ اس دلکشی میں کوئی نہ کوئی پیغام اور مثبت و تعمیری پہلو ضرور تلاش کرتے ہیں۔ یعنی وہ جمالیات کے ساتھ افادیت کی ہم آہنگی چاہتے ہیں۔ وہ فنی خصوصیات کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے لیکن ان سب کا مقصدیت سے ربط ان کے نزدیک ضروری ہے۔ اس نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے سید محمد عقیل رقم طراز ہیں:

''احتشام حسین کی عملی تنقید انہیں خیالات و نظریات کی روشنی میں ہوتی ہے وہ جب کسی ادبی تخلیق پر نظر ڈالتے ہیں تو سب سے پہلے اس کی تاریخی اور سماجی اہمیت کا تپہ لگاتے ہیں۔ پھر وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ادیب نے

---

[1] ترقی پسند تنقید کا ارتقا اور احتشام حسین۔ ڈاکٹر شمیمہ بیگم۔ ص۔ ۵۹۶۔۵۹۷

حالات سے کس قسم کے اثرات قبول کئے ہیں۔ اور اپنے ماحول اور زمانے کی ترجمانی میں وہ کس حد تک کامیاب ہوا ہے۔ اس نے کوئی پیغام دیا ہے یا نہیں۔ سوچ سمجھ کر باتیں کی ہیں یا نہیں یا اپنے آپ کو جذبات کی رو میں بہا دیا ہے؟ اور آخر میں وہ یہ دیکھتے ہیں کہ اس کی فنی اور جمالیاتی اہمیت کیا ہے؟''[1]

احتشام حسین پر بہت سارے اعتراضات ہوئے ان میں ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ انہوں نے اردو تنقید میں کوئی اضافہ نہیں کیا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ احتشام حسین کے بڑے سے بڑے مخالف نے بھی ان کے کارناموں کا اعتراف کیا۔ انہوں نے اردو تنقید کو بہت کچھ دیا۔ سنجیدہ اور عملی نقطہ نظر، سماجی شعور اور ادرک اور تہذیبی بصیرت سے مالا مال کیا۔ ادبی معاملات میں کوئی بھی رائے حتمی اور آخر نہیں ہوتی۔ احتشام حسین کی آرا سے بھی اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن انکے یہاں جو ایک علمی اور منطقی اور سب سے بڑھ کر تعمیری پہلو ہے اس سے انکار ممکن نہیں۔ اس طرح یہ بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اردو میں مارکسی یا ترقی پسند تنقید جو اختر حسین رائے پوری سے شروع ہوئی تھی وہ ایک آغاز تھی۔ لیکن اس نظریے کو تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ احتشام حسین نے جس اونچائی پر پہنچایا وہ ایک طرح سے نشان آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کا سب سے بڑا رول یہ ہے کہ انہوں نے اردو میں اپنے جدید ترین خیالات اور افکار کے ذریعے

---

[1] تنقید اور عصری آگہی۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل۔ مطبوعہ انجمن تہذیب نو، الہ آباد۔ ۱۹۷۶۔ ص۔ ۲۷۳

وسعت اور تنوع کی فضا قائم کی۔ اس کو مختلف جہتیں عطا کی اور اسے اس معیار پر پہنچایا کہ یہ مغربی ادبیات کے مقابل کھڑا ہونے کے قابل ہوئی۔

اختر انصاری:

اختر انصاری بھی ترقی پسند تنقید کا ایک اہم نام ہے۔ لیکن کچھ ان کی بے نیازی اور کچھ نقادوں کی بے اعتنائی نے اختر انصاری کو اس قدر معروف نہ ہونے دیا جس کے وہ مستحق تھے۔ وہ خاموش طبع لیکن بہت متین اور سنجیدہ نقاد تھے۔ ترقی پسند تحریک سے ان کا رشتہ تشہیر اور شور شرابے والا نہیں تھا۔ وہ ہنگامی جلسے جلوسوں کے بھی قائل نہ تھے لیکن وہ اس تحریک سے لگاؤ رکھتے تھے۔ ان کی پہلی تصنیف ''مطالعہ وتنقید'' (مضامین کا مجموعہ) کے نام سے شائع ہوئے یہ مجموعہ مضامین ان کے تقریباً ۱۵ برسوں کے مضامین پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے میں ''ادب اور سیاست''، ''اردو غزل''، جنگ سیاست اور شاعری، ''قدیم انسان''، احساس فن اور اظہار جیسے مضامین شامل ہیں۔ دوسرے مضامین مجاز کی شاعری اور اقبال کی شاعری کا نیا آہنگ ان کے نظریے اور موقف کی مثالیں ہیں۔ ان کا نظریہ ادب افادی، تعمیری اور کچھ حد تک مقصدی ہے۔ مذکورہ مضامین کو انہوں نے اسی پیمانے کو سامنے رکھ کر تحریر کیا ہے۔ ان کے دوسرے مضامین جو فکشن سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں بھی اعتدال اور توازن کے ساتھ مارکسی فکر کی جلوہ گری ظاہر ہے۔ اختر انصاری کی نگاہ اردو ادب کے ساتھ عالمی روایات پر بھی ہے اور اس کا اندازہ اس کے مطالعے کے عمق اور فکر کے عروج سے لگایا جا سکتا ہے۔ اختر انصاری نے افادی ادب کی بابت اظہار خیال کرتے

ہوئے ادب کے متعلق اپنے نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ادب زندگی کی تفسیر بھی ہے تنقید بھی ہے وہ زندگی کے ترجمانی کرتا ہے۔ وہ اپنے زمانے کے سماجی، سیاسی اور معاشی ماحول کی صرف عکاسی نہیں کرتا بلکہ اس میں رنگ بھی بھرتا ہے مختصر یہ کہ وہ زندگی سے اثر پذیر بھی ہوتا ہے اور زندگی پر اثر انداز بھی۔''[1]

''کامیاب مقصدی ادب وہی ہے جو مقصدی ہونے کے باوجود اصول جمالیات کی پیروی کرتے ہوئے فن کے اعلیٰ معیار پر پورا اترے۔ وہ سچے ادب کی طرح جذباتی جمالیاتی اور تخیلی تجربات کا اظہار ہو۔''[2]

مندرجہ بالا نظریہ خواہ وہ تنقید کے متعلق ہو یا ان کی تنقید نگاری کے متعلق ہو وہ ان کی تصنیف افادی ادب کے علاوہ ان کی دوسری تصنیفات ایک ادبی ڈائری، غزل اور درس غزل، حالی اور نیا تنقیدی شعور، مطالعہ وتنقید، غزل کی سرگزشت، غزل اور غزل کی تعلیم اور اردو فکشن بنیادی وتشکیلی عناصر وغیرہ میں بھی ہر جگہ موجود ہے۔ افادی ادب کو ان کے دوسرے مضامین کے مقابلے بہت اہم تصور کیا جاتا ہے۔ یہ مضمون اپنے وقت کی ضرورت تھا۔ یہ مضمون اس موقع پر منصۂ شہود پر آیا جبکہ افادی ادب کا تصور لوگوں کے ذہن

---

[1] افادی ادب۔ اختر انصاری۔ ص۔ ۸

[2] افادی ادب۔ اختر انصاری۔ ص۔ ۹۴

میں واضح نہیں تھا۔طرح طرح کنفیوژن پیدا ہورہے تھے۔اختر انصاری نے اس مضمون کے ذریعے نہ صرف اپنے موقف کی مدلل وضاحت کی بلکہ پہلی دفعہ بہت ہی توازن کے ساتھ افادی ادب کی افہام وتفہیم کی راہ ہموار کی۔اس بابت اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر خلیل الرحمٰن نے لکھا ہے:

''افادی ادب پر ان کا مقالہ اردو زبان میں اپنی نوعیت کا پہلا مضمون ہے۔ جسے متوازن کہا جاسکتا ہے۔ اختر انصاری نے مقصدی ادب سے متعلق نظریات کی چھان پھٹک کی اور دنیا کے ادبی شاہکاروں کو سامنے رکھ کر ادب کی افادیت پر ایک مفصل اور بسیط مقالہ لکھا۔ اس مقالے میں ادب اور زندگی کے تعلق پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اردو کی جدید تنقید کے لئے اب کوئی نئی چیز نہیں رہی۔لیکن اس مقالے کو غور سے پڑھا جائے تو اس میں بعض باتیں ایسی ملتی ہیں جن کی طرف میں ان اصولوں کو برتنے کی کوشش کی۔''[1]

اختر انصاری ابتدا میں ادبی روایات کے حامی تھے اور ادب میں تفریحی اور روایتی موضوعات و اسلوب کے قائل تھے۔لیکن جب انہوں نے مارکس کے جدلیاتی مادیت کا غائر مطالعہ کیا تو وہ رفتہ رفتہ اس نظریے کے حامی ہوگئے آگے چل کر ان کا نظریہ وہی ہوگیا جو ترقی پسند نقادوں کا تھا۔آغاز میں وہ جن چیزو

---

[1] اردو تنقید کے معمار۔مرتبہ ایم حبیب خان۔انڈین بک ہاؤس۔علیگڑھ۔۱۹۶۵۔ص۔۵۷۔۵۵

کو ادب کا قیمتی سرمایہ تصور کرتے تھے بعد میں انہوں نے ان تمام ادب پاروں کو جنہیں انہوں نے تخلیق کیا تھا انہیں پر فریب اور بے معنی تصور کیا اور زندگی کے تلخ حقائق اور طبقاتی کشمکش کو اپنا موضوع بنانا وقت کی ضرورت سمجھا۔ ظاہر ہے جب نظریہ تبدیلی ہوتا ہے تو موضوعات کے ساتھ لب ولہجہ بھی بدل جاتا ہے۔ اختر انصاری کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس تبدیلی کے اثرات ان کے مضمون ''افادی ادب'' پر بہ آسانی دیکھ سکتے ہیں۔ انہوں نے سائنٹفک نظریے کو اپنانے کے ساتھ ہی ادب برائے ادب کے تصور کو ذہن سے جھٹک دیا اور انہوں ں ے سماجی سیاسی اور معاشی ماحول کے ترجمان کے لئے خود کو وقف کر دیا۔ اختر انصاری کے مطابق ادب اور فن انفرادی جذبات اور احساسات کا نہیں بلکہ سماجی اجتماعی شعور اور خارجی عوامل کے تابع ہوتا ہے۔ اور نہیں ہے تو اسے ہونا چاہئے۔ وہ اس لئے کہ اس کے ذریعہ معاشرے میں خوشگوار اور انصاف پر مبنی ماحول سازگار ہوتا ہے۔ اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد وہ ادیبوں اور شاعروں کو مشورہ دیتے ہیں کہ سماجی مقاصد کو سامنے رکھتا۔ سب کیلئے لازمی ہے۔ اگر کوئی ادیب اس سے انحراف کی راہ اپناتا ہے تو سمجھے وہ فرار کی راہ اپناتا ہے۔ وہ اپنے منصب اور ذمہ داری کے تئیں بے حس ہے اور اس کا ادب پارہ کسی لائق نہیں۔ ان کے مطابق سماج اور معاشرے سے کٹ کر ادب تخلیق کرنے والا سماج اور معاشرے سے الگ ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ رقم طراز ہیں:

> ''ہم اس امر کو کہ ادب اپنے زمانے کی اجتماعی زندگی سے الگ گہرا
> اور براہ راست تعلق رکھتا ہے۔ ادب کی ایک بنیادی خصوصیت اس لئے

خیال کرتے ہیں کہ اجتماعی زندگی بہر حال اور انفرادی زندگی سے زیادہ اہم ہے.....فرد کی شخصیت، فرد کی سیرت اور فرد کی زندگی ایسی چیزیں ہیں جو سوسائٹی کے بغیر تصور میں نہیں آسکتیں.....انسان کو ایک زندہ وجود اسلئے خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ماحول سے گہرا اور وسیع تعلق رکھتا ہے۔ انسان حقیقت میں اسی وقت تک انسان ہے جب تک وہ انسانی جماعت کا فرد ہے۔ اس کی زندگی اس اجتماعی پس منظر سے علاحدہ ہوکر کوئی معنی نہیں رکھتی ۔ادب کا موضوع فرد کی زندگی کے بجائے اجتماعی زندگی ہونا چاہئے تو یہ کوئی بے جا مطالبہ نہیں ہے۔''[1]

اختر انصاری کے مطابق ادب سے اجتماعی زندگی کا تعلق لازماً ہے اور یہ اس لئے ضروری ہے کہ ادیب ہر حال میں سماج سے مفر حاصل نہیں کرسکتا اور اسے سماج میں ہی رہنا ہوتا ہے۔ وہ بھی سماج کے سرد وگرم، خوشگوار نا خوشگوار اور ڈھیر سارے مسائل ومصائب سے دوچار ہوتا ہے۔ اس لئے وہ ان حالات کو نظر انداز نہیں کرسکتا اور حالات کو سازگار اور معاشرے کے موافق بنانے میں اس کو آگے آنا ہوتا ہے اور یہاں آکر اسے کسی نہ کسی نظریے اور نصب العین کو اپنانا پڑتا ہے جس کی وجہ سے وہ سماج کو اپنے پیغامات پہنچاتا ہے۔ اختر انصاری نے اپنی تنقیدی تحریروں کے ذریعے ادب سے نہ صرف سماج اور معاشرہ کو جوڑا

---

[1] افادی ادب۔ اختر انصاری۔ آزاد کتاب گھر۔ ۱۹۵۹۔ طبع چہارم۔ ص۔ ۳۸

ہے بلکہ پوری دنیا سے اس کا تعلق پیدا کرنے پر زور دیا ہے۔ وہ ادب میں عشق و معاشقہ اور معاملہ بندی کو سراسر زیادتی اور کم عقلی تصور کرتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ اختر انصاری دوسرے ترقی پسندوں کی طرح ادبی حسن کے مخالف نہیں ہیں۔ وہ جمالیات کے وُجوب پر زور دیتے ہیں۔ شعریت اور ادبیت اور فنی خوبیوں کے معترف ہیں۔ بلکہ وہ جمالیاتی اوصاف کے بغیر ادب کو بے روح سمجھتے ہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ کوئی بھی ادب پارہ صرف نظریے کی تشہیر اور تبلیغ سے موثر اور کامیاب نہیں ہوسکتا اسے کامیاب اور دیرپا ہونے کے لئے فنی لطافت، اور محاسن کا سہارا لینا ہی ہوگا۔ اس طرح کے خیالات گزشتہ سطور میں اور بھی کئی نقادوں کے یہاں نظر آتے ہیں۔ جو انتہا پسندی سے الگ معتدل اور متوازن راہ اپناتے ہوئے ادبی محاسن کا التزام رکھتے ہوئے ادب پارہ خلق کرنے پر زور دیتے ہیں۔ یہاں مذکورہ نقادوں کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے اس بابت اختر انصاری نے جو وضاحت کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

> ''کامیاب مقصدی ادب وہی ہے جو مقصد ہونے کے باوجود اصول جمالیات کی پیروی کرتے ہوئے فن کے اعلی معیار پر پورا اترے۔ وہ ادیب کے جذباتی جمالی اور تخیلی تجربات کا اظہار ہو۔ یعنی خارجی حقیقتوں کی بے جان عکاسی اور عقلی یا فلسفیانہ عقیدوں کی بے جان تشریح و توضیح کے بجائے ان حقیقتوں اور عقیدوں کے جذباتی اور وجدانی تصورات کو صداقت شعار انداز میں پیش کرے۔ اس کی صداقت علمی یا حسابی صداقت نہیں۔ فنی

وشعری صداقت ہو، اس میں مقصد کو براہ راست پیش کرنے کے بجائے
اشارات وکنایات سے قاری کے ذہن وشعور پر اثر ڈالنے کی کوشش کی گئی
ہے۔ نیز یہ کہ اس میں زبان کی باریکیوں کا پورا لحاظ رکھا گیا ہو۔''[1]

شاید اختر انصاری کے انہیں خیالات کے سبب ان پر یہ لزام عائد کیا گیا کہ یہ معاشرے سے الگ ادبیت اور شعریت پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ لیکن اختر انصاری ان تمام نعروں سے معمور اور شدت آمیز ادب پاروں کو محض پروپگنڈہ سمجھتے ہیں۔ انہیں ادب کے کسی خانے میں نہیں رکھتے۔ ان کا نظریہ ہے کہ صرف ترقی پسند ادب ہی نہیں بلکہ ہر طرح کے ادب میں پروپگنڈہ کا عنصر ہوتا ہے لیکن ادبا شعرا کو اپنے نظرے اور رجحان کو پیش کرنے کے دوران توازن اور اعتدال سے کام لینا چاہئے۔

افادی ادب کے علاوہ اختر انصاری کی دوسری تحریروں کا اوپر ذکر ہو چکا ہے ہر مقام پر انہوں نے شعور وآگہی اور بصیرت کا ثبوت فراہم کیا ہے اور اپنے طور پر مارکسی نظریے کی مثبت تفہیم کی کوشش کی ہے۔ وحید اختر نے ان کے یہاں بعض ایسے نکات کی نشاندہی کی ہے جو انہیں ترقی پسندوں سے الگ کرتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ:

''شاعری میں انہوں نے کبھی ترقی پسندی کے دور عروج کا برہنہ اور
براہ راست اظہار نہیں اپنایا لیکن تنقیدی نظریات اور مطالبوں میں وہ ادب

---

[1] افادی ادب۔ اختر انصاری۔ ص۔ ۹۲

کی افادیت اور غایتی قدروں کو ہمیشہ اہمیت دیتے رہے۔ ان کی تنقید اور تخلیق میں میں تھوڑا فاصلہ ہمیشہ برقرار رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی پسندوں نے انہیں وہ اہمیت نہیں دی جس کے وہ مستحق تھے۔''[1]

ڈاکٹر وحید اختر کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ ترقی پسند انہیں ہر لحاظ سے یعنی تخلیق اور تنقید دونوں اعتبار سے مارکسی دیکھنا چاہتے تھے جس پر وہ کھرے نہیں اترے اور نظر انداز کئے گئے لیکن یہی چیز اختر انصاری کو انفرادی حیثیت کی حامل بھی بناتی ہے کہ انہوں نے ادبیت، شعری کے ساتھ ساتھ سماجی تقاضوں کو بھی ضروری مانا ہے۔ یہ توازن اور اعتدال ہی انہیں ممتاز کرتے ہیں۔

عزیز احمد:

اردو کے افسانوی ادب میں عزیز احمد کی مقبولیت مستحکم ہے انہوں نے ''گریز'' اور ایسی بلندی ایسی پستی جیسے ناولوں کی تخلیق کے ذریعے حد درجہ مقبولیت حاصل کی۔ اس کے علاوہ مترجم اور تاریخ نویس کے طور پر بھی انہوں نے اپنی شناخت بنائی۔ لیکن اردو کی ترقی پسند تنقید کے حوالے سے بھی ان کو یاد رکھنا ضروری ہے۔

تنقید میں عزیز احمد کی دو تصانیف ''ترقی پسند ادب'' اور ''اقبال نئی تشکیل'' موجود ہیں۔ جستہ جستہ کچھ مضامین بھی شائع ہوئے ہیں۔ لہٰذا ان کا کل تنقیدی سرمایہ دو کتابیں اور چند مضامین ہیں۔ لیکن ان کے غائر مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ عزیز احمد کے یہاں کس قدر مطالعے میں گہرائی اور شعور کی بالیدگی

---

[1] جدید اردو تنقید۔ شارب ردولوی۔ ص۔ ۳۸۳۔۳۸۲

موجود ہے۔ وہ اپنے موضوع کے تمام ماخذات ومصادر پر عمیق نگاہ رکھتے ہیں وہ اس لئے کہ وہ مغرب میں رہے اور مغربی ادبیات کی تمام خوبیوں سے واقفیت حاصل کی۔ ان کا طرز تنقید اکثر مقام پر سائنٹفک اور تجزیاتی ہے۔ وہ جس موضوع کو اٹھاتے ہیں اس کے تمام سیاق وسباق اور جزئیات کے متعلق معلومات فراہم کرتے ہیں۔ اور قاری کو اخیر میں احساس ہوتا ہے کہ موضع کا حق تو ادا ہوا ہی ساتھ ہی ناقد کی بصیرت اور آگہی کا بھی درک سامنے آیا۔ اس دعوی کی دلیل کے طور پر ان کی دونوں مذکورہ تصنیفات کو پیش کر سکتے ہیں۔

عزیز احمد نے جس وقت میدان ادب میں قدم رکھا۔ وہ دور ترقی پسند تحریک کے عروج کا دور تھا۔ اس لئے بہت سے دوسرے ادبا شعرا کی طرح وہ بھی ترقی پسند تحریک سے قریب ہوئے۔ انہوں نے بھی ادبی تنقید کے لئے جو موقف اختیار کیا وہ ادب کا مادی نظریہ تھا۔ اس زمانے میں اختر حسین رائے پوری، مجنوں گورکھپوری ممتاز حسین، علی سردار جعفری اور احتشام حسین جیسے مارکسی ناقدین اس تحریک اور اس کے نظریات پر خامہ فرسائی کر رہے تھے۔ عزیز احمد نے اسی موقع پر اپنی کتاب ترقی پسند ادب لکھی۔ گرچہ یہ کتاب ترقی پسند ادب کی تفہیم پر مرکوز ہے لیکن اصل میں یہ ان لوگوں کو ایک طرح سے جواب بھی تھی جو ترقی پسند تحریک کے خلاف صف آرا تھے۔ اور طرح طرح کے شک وشبہات پھیلا کر اس تحریک کو نقصان پہنچا رہے تھے۔ انہوں نے بڑا کام یہ کیا کہ اس تحریک کے نظریات کی وضاحت کی اور اس کی موجودہ سماج میں ضرورت اور اس کی افادیت کو ظاہر کیا۔ حالانکہ ان کی اس تصنیف کا کوئی بہت زیادہ اثر مرتب نہ ہو سکا۔ لیکن انہوں نے اس کا دفاع کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ اس پوری کتاب کی ایک بڑی خوبی

یہ ہے کہ انہوں نے جوش بیان کے دوران کہیں بھی شدت اور انتہا پسندی کا راستہ نہیں اپنایا ہے۔ چونکہ ان کا ذہن وسیع اور دل فراخ تھا اس لئے ترقی پسند تحریک کے کسی مخالف کو انہوں نے برا بھلا نہیں کہا۔ حالانکہ عام طور پر ترقی ادب کے حامیان اور ناقدین نے ان کے برعکس انداز اپنایا۔ سرمایہ داروں اور رجعت پسندوں کے علاوہ ان کے برعکس انداز اپنایا۔ سرمایہ داروں اور رجعت پسندوں کے علاوہ انہوں نے ان ادبا و شعرا کو اپنے طعن و تشنیع کا ہدف بنایا جو ان کے منشور سے الگ ادب تخلیق کر رہے تھے۔ ظ۔ انصاری تو اقبال کو اسلامی فاشسٹ تک کہہ دیا۔

عزیز احمد کے یہاں دوسرے بہت سے مارکسی ادیبوں اور نقادوں کے برعکس ایک سنجیدہ اور علمی انداز ملتا ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ تحریک کے دوران خلق کئے گئے ادب پاروں میں وہ ایک توازن کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ ''اقبال نئی تشکیل'' میں عزیز احمد نے عملی تنقید اور سائنٹفک رجحان دونوں کو یکساں طور پر پیش کیا ہے۔ گزشتہ سطور میں صاف طور پر لکھا گیا کہ ان کا تنقیدی سرمایہ کم ہے لیکن جتنا اور جو کچھ ہے وہ ان کے گہرے ادراک اور تنقیدی بصیرت و آگہی کا ثبوت ہے۔ ان کے یہاں مطالعے کی گہرائی اور عملی و تجزیاتی تنقید کی بھی عمدہ و آگہی کا ثبوت ہے۔ ان کے یہاں مطالعے کی گہرائی اور عملی و تجزیاتی تنقید کی بھی عمدہ مثالیں موجود ہیں۔ عزیز احمد کو جیسا کہ کہا گیا کہ متوازن اور سائنٹفک ناقد کے طور پر جانا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی تنقید کو کبھی مارکسی نظریے کا اشتہار نہیں بنایا بلکہ ادب و فن کو سماجی اہمیت اور اجتماعی مفاد کی اہمیت کو تسلیم کیا اور ادبی ترقی پسند اور انسان دوستی کی تلاش، ایک سچے اور مشاق محقق کی

حیثیت سے ہے۔ وہ ترقی پسند ادب کے بابت وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''ادب کی انسانیت کا نظریہ بہت پرانا ہے۔ تمام تر اخلاقیات کی اسی بنا پر بنیاد ہے۔ اشتراکیت میں انسانیت کا احساس، معاشی مواقع کی یکساں فراہمی اور یہ اصول ہے کہ کوئی انسان اور انسان سے محبت سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکے۔ پرانا نظریہ انسانیت، انسان کی اکثریت کے معاشی اور اقتصادی مفادات کو بڑی حد تک فراموش کرتا آیا تھا۔ یہ انسانیت کا نیا پہلو ہے اور اس لیے بہت اہم ہے۔''[1]

ادب اور آرٹ کو انسانی زندگی کے لیے لازمی قرار دیتے ہیں۔ وہ ادیب اور اس کے ادب پاروں کو آزاد فضا میں سانس لیتا ہوا دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ اظہار خیال کی آزادی اور جذبات و احساس کی سچی ترجمانی کے حامی ہیں۔ وہ ترقی پسندوں کے نظریے کی حمایت کرتے ہیں اور مانتے ہیں کہ ادب انسان کی زندگی کا عکس اور اپنے اطراف کی پیداوار ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ طبقاتی کشمکش اور سماجی جکڑ بندیوں کو نقصان دہ مانتے ہیں۔ ان کے یہاں بیشتر مقامات پر تجزیہ اور تحلیل کا عمل دکھائی دیتا ہے۔ وہ اپنے نظریہ کو پیش کرنے کے دوران کی شدت اور قطعیت کا شکار نہیں نظر آتے بلکہ ہر جگہ ایک محتاط اور متوازن انداز سے کام لیتے ہیں۔ وہ ترقی پسند تحریک کے باقاعدہ رکن نہیں ہیں لیکن اس تحریک کے بعض بنیادی اور تعمیری

---

[1] ترقی پسند ادب، عزیز احمد۔ ادارہ اشاعت اردو حیدرآباد ۱۹۴۲ء صفحہ۔ ۳۴

نکات کو پسند کرتے ہیں۔ان کا موقف ہے کہ زندگی ادب کا چولی دامن کا رشتہ ہے۔زندگی میں تغیر وتبدل ہوتا ہے تو ادب بھی متاثر ہوتا ہے۔ادب اور زندگی کے باہمی رشتے کو بہت ہی واضح الفاظ میں ظاہر کرتے ہوئے وہ ادب اور زندگی کو باہم شیر وشکر تصور کرتے ہیں۔اس ضمن میں ڈاکٹر مخمور صدری عزیز احمد کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے:

''عزیز حمد کا خیال تھا کہ جب زندگی بدلتی ہے تو ادبی رجحانات میں انقلاب آتا ہے اور جب ادب بدلتا ہے تو اس کی تنقید بدل جاتی ہے۔یہ جدلیاتی عمل ہے جو ہمیشہ جاری رہتا ہے۔اس لیے کہا جاتا ہے کہ ہر دور اپنی ادبی تاریخ تو رکھتا ہے اور اپنا تنقیدی نظریہ اور پیمانہ وضع کرتا ہے۔بعض دفعہ پیمانہ قدیم ہوتا ہے اور بعض اوقات جدید۔عزیز احمد کے خیال میں تنقیدی معیار عموماً اس وقت بدلتے ہیں جب زندگی اور ادب کے معیار بدلتے ہیں مثلاً ۱۸۵۷ء کے اثرات سے اردو تنقید میں انقلاب برپا ہوا۔یعنی حالی کا 'مقدمہ شعر وشاعری'' منظر عام پر آیا۔ زندگی، ادب اور تنقید باہم ایک دوسرے کو متاثر کرتے رہتے ہیں لیکن اسے بہت کم سمجھا گیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ تخلیق کے بندھے ٹکے اصولوں سے ذرا سا انحراف کرتے ہی ناقدین لٹھ لے کر شاعر وادیب کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔''[1]

---

[1] اردو میں ترقی پسند تنقید مخمور صدری۔صفحہ ۲۹۳

عزیز احمد نے پرانی تنقید کی بالادستی کا ذکر کرتے ہوئے اسے تخلیق کار کن آزادی کی راہ میں مانع تصور کیا ہے۔ اور ان ناقدین اور دانش وروں کو اپنا ہدف بنایا ہے جو تنقید کو آسمانی صحیفہ سمجھ کر کسی بھی نئے تجربے اور نیا پن کو گناہ قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں عزیز احمد نے اپنے موقف کی وضاحت صاف طور پر کر دی ہے۔ وہ رقم طراز ہیں۔

> ''اب تک مشرق وسطی کے ادب میں بالعموم اور اردو ادب میں بالخصوص الٹی گنگا بہتی تھی۔ تنقید اپنے آپ کو مطلق العنان سمجھتی تھی۔ اسی لیے وہ ادب کو ارسطو یا اس کے مشرقی جانشینوں کے اصولوں سے سرمو انحراف کرنے نہیں دیتی تھی جہاں ادب نے کوئی اپج دکھائی وہ ادیب سے لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتی تھی۔ حال حال تک تنقید میں جاگیرداری کے نظام کی سی آمریت تھی۔ اس کا حربہ تعصب تھا۔ جس طرح کا تعصب تنقید کو ادب سے تھا۔ اسی طرح کا تعصب ادب کو زندگی سے تھا۔ فرق اتنا تھا کہ تنقید کی حکومت ادب پر چل گئی لیکن ادب کی حکومت زندگی پر کیسے چل سکتی تھی۔''[1]

عزیز احمد تنقید میں نئے رجحانات کے حامی ہیں اور تنقید کی بالادستی کے مخالف۔ ان کے مطابق تنقید کو

---

[1] پاکستان میں اردو تنقید کے پچاس سال۔ بحوالہ شہزاد منظر۔
منظر پبلی کیشنز گلشن اقبال۔ کراچی۔ ۱۹۹۶ء صفحہ ۱۰۳

روایت کا پابند نہیں ہونا چاہئے۔قدیم تذکرہ نگاروں اور نقادوں نے جو فرمان جاری کر دیئے وہ ہرگز حرف آخر نہیں ہو سکتے کیونکہ وقت اور حالات کے حساب سے رویے بدلتے ہین ،نظریے بدلتے ہیں اور سوچ کا زاویہ بدلتا رہتا ہے۔لیکن کسی ایک نظریے پر اکتفا کرنا یا اس کا پابند ہونا ضروری نہیں۔آج کا ادب معاشرت اور انسان کے دکھ سکھ سے عبادت ہے اس لیے موجودہ ادب کو اس کے تقاضے کے لحاظ سے آگے بڑھنا ہے۔وہ تنقید اور تخلیق دونوں کو اہم گردانتے ہیں۔وہ اس خیال کی تردید کرتے ہیں کہ صرف تخلیقات ہی ادب اور سماج کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ان کے مطابق تنقید بھی یہی کام کرتی ہے۔اگر کوئی نقد پارہ ادب اور سماج کو نظر انداز کر کے چلتا ہے تو وہ اپنے منصب سے گمراہ ہوتا ہے۔عزیز احمد چونکہ ادب میں حقیقت پسندی کے قائل ہیں اس لیے ان کی اکثر تحریروں میں اس بابت اظہار کرتے ہوئے حقیقت نگاری کے رجحان پر بہت ہی صراحت کے ساتھ بحث کی ہے۔اس نوعیت کی بحث پہلی دفعہ ان کے یہاں نظر آتی ہے۔ان کے مطابق حقیقت نگاری ادب کو زندگی کے نزدیک دیکھنا چاہتی ہے اور اسے بامعنی بنانا چاہتی ہے وہ بہت ہی مثبت انداز اپناتے ہوئے قدیم وجدید تنقید کے مابین رسہ کشی کی صورتحال کو بیجا قرار دیتے ہیں۔وہ دونوں طریقہ ہائے تنقید کو سراہتے ہیں۔وہ دونوں کا مقصد ایک مانتے ہیں۔

> ''حقیقت نگاری کی جدید تحریک قدیم ادب کی دراصل مخالف نہیں گو
> وہ بظاہر مخالف معلوم ہوتی ہے۔وہ پہلے کی کمی پورا کرنا چاہتی ہے۔زندگی
> کے جو جو پہلو تشنہ رہ گئے ہیں۔حقیقت نگار ادب ان کو تفصیل سے پیش کرنا

چاہتی ہے۔ جہاں تک ادبی روایت شکنی کا تعلق ہے وہ بے شک پرانے
ادب سے بغاوت پر مجبور ہے۔ مگر ذرا اور زیادہ آگے بڑھ کر دیکھئے تو دونوں
کا مدعا ایک ہے، راستے الگ الگ ہیں۔''[1]

عزیز احمد ادب میں حقیقت نگاری کے ساتھ جمالیات کو بھی مساوی اہمیت دیتے ہیں۔ اس بابت ان کا تصور بالکل واضح ہے۔ وہ مقصدیت کے گاڑھے پن کو ادب کے لیے مضر قرار دیتے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری کی طرح وہ بھی بغیر جمالیات اور فنی محاسن کے کسی بھی نظریے یا رجحان کی تشہیر و تبلیغ کو عبث قرار دیتے ہیں۔ چونکہ عزیز احمد خود ایک بڑے ناول نگار تھے اس لیے ان کے اندر کا فن کار انہیں فن سے انحراف نہیں کرنے دیتا۔ اور نہ ہی نئے شعور اور سماجی تقاضوں کی تلخی سے دور کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی تنقیدی تحریروں میں بھی تخلیقی شان موجود ہے اور وہ اعتدال کے ساتھ اپنے موقف پر بھی قائم و دائم نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالعلیم

ڈاکٹر عبدالعلیم بھی کم و بیش سجاد ظہیر کی ہی طرح معتدل اور متوازن مزاج و منہاج کے مارکسی نقاد ہیں۔ وہ بھی کثیر المطالعہ نقاد ہیں اور ادب کی ہر صنف پر عمیق نظر رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں بھی مارکسی نقادوں کی طرح انسانی مسائل اور معاشی و سماجی صورتحال پر اتکاز ہے۔ لیکن وہ بھی ادب کی جمالیاتی قدروں کے حامی ہیں۔ ان کے یہاں بھی مارکسی نقادوں کی طرح انسانی مسائل اور معاشی و سماجی صورتحال

---

[1] ترقی پسند ادب۔ عزیز احمد۔ صفحہ۔ ۹

پر ارتکاز ہے۔لیکن وہ بھی ادب کی جمالیاتی قدروں کے حامی ہیں ۔ان کے یہاں بھی تنقید میں شدت پسندی، اشتعال اور انتہا پسندی سے سراسر اجتناب نظر آتا ہے۔ وہ بھی ترقی پسند تنقید کے بنیاد گزاروں میں شمار کئے جاتے ہیں ۔نہوں نے اب وتنقید پر بہت کچھ لکھا لیکن وہ سب کتابی صورت میں منظر عام پر نہیں آسکے۔ان کے جو مضامین شائع ہوئے اور ادب کے سنجیدہ حلقوں میں مقبول ہوئے ان میں ''اردو ادب کے رجحانات پر ایک نظر''''ادبی تنقید کے بنیادی اصول'' اور''ادب اور مارکسزم''اہم ہیں۔ان مضامین کے ذریعے ان کے نظریات بالخصوص ترقی پسند رجحانات کا واضح اندازہ ہوتا ہے۔ وہ ایک سائنٹفک رجحان کے نقاد تھے اس لیے تجزیہ غالب ہے وہ خیالی اور تصوراتی باتوں سے الگ معروضی ،منطقی اور استدلالی انداز نظر کو اولیت دیتے ہیں ۔وہ مارکسیت کی افادیت کو ثابت کرتے ہوئے اور جدلیاتی مادیت کی ضرورت کو اہم بتاتے ہوئے ایسے زندگی کے یا بہترین نقطۂ نظر گردانتے ہیں ساتھ ہی وہ نئی اور جمالیاتی اقدار کو بھی لازمی تصور کرتے ہیں ۔وہ تنقید کے بنیادی امور پر بحث کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''ادبی تنقید کا مقصد یہ ہے کہ ادب کو پڑھنے والوں کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے۔ جو ادیب سنجیدہ پڑھنے والوں کو اپنا مخاطب بنانا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ انسانی زندگی کی کشمکش کی تصویر کھینچے اور جہاں تک ممکن ہو پڑھنے والوں کے تجربات اور مشاغل سے لگاؤ پیدا کرے تا کہ انسانی ماحول کا مکمل خاکہ سامنے آسکے ۔ ناقد کا فرض ہے کہ وہ ادبی

کارناموں کو اس معیار سے جانچے۔ تنقید نہ صرف پڑھنے والوں کے لیے ضروری ہے بلکہ مصنف کے لیے بھی اہم ہے ناقد کا یہ کام ہے کہ ادب کے میدان میں جو ترقی ہوئی اس کی کیفیت کو واضح کرے اور ادیبوں کے کارناموں سے علم انسانی میں جو اضافہ ہوا ہے اس کو مرتب طور پر پیش کرے .....ناقد کے لیے ضروری ہے کہ وہ ادبی کارناموں کی تاریخی اہمیت کو واضح کرے ادیب کی دماغی صلاحیت کا معائنہ کرے، ان عناصر کو جانچے جو ادیب نے استعمال کئے ہیں۔ ادیب کے نقطہ نظر اور مقاصد سے بحث کرے۔''[1]

ڈاکٹر عبدالعلیم نے مجنوں گورکھپوری کی طرح ترقی پسند نظریات میں توسیع کی خاطر کچھ اہم نکات کا اضافہ کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ سماجی، اقتصادی اور عمرانی طریقے سے اگر ادب پاروں کا تجزیہ کیا جائے تو صرف زندگی میں خلفشار اور کشمکش کی صورتحال ہی واضح ہوگی۔ اسی طرح اگر صرف جمالیاتی اقدار کے ساتھ تفریحی ادب کو خلق کیا جائے گا تو یہ بھی کارعبث ہوگا۔ لہٰذا ان دونوں حالات میں توازن اور انبساط پیدا کرنا ضروری ہوگا۔ نقادوں کے لیے یہ لازمی ہے کہ وہ ایک طرف جہاں سماجی، اقتصادی اور عمرانی معلومات حاصل کریں اور تنقید کو سائنٹفک بنائیں وہیں دوسری طرف فن اور فنی محاسن کو بھی ملحوظ خاطر رکھیں

---

[1] ادبی تنقید کے بنیادی اصول۔ ڈاکٹر عبدالعلیم (ماہنامہ نیا ادب) صفحہ ۹۶۔۹۵

تب ہی جا کر ایک بامعنی ،افادی اور خوبصورت ادب پارہ تخلیق ہوگا۔

ڈاکٹر عبدالعلیم کا طریقہ تنقید یہ ہے کہ وہ اپنی تنقیدات کے ذریعے حیات انسانی کو بامعنی اور خوبصورت بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ان کے یہاں حقیقت پسندی کا شائبہ نہیں۔وہ ادیب اور شاعر کو سماج کا اہم جز قرار دیتے ہیں اس لیے انہیں سماجی عوامل کے معاملے میں بہت حد تک ذمہ دار تصور کرتے ہیں۔وہ چاہتے ہیں کہ ادیب اپنی اطراف و جوانب سے بے خبر اور لاتعلق نہ رہے۔وہ مانتے ہیں کوئی بھی قلم کار کسی بھی نظریے سے نقطۂ نظر سے لاتعلق نہیں ہوتا اور اسے لاتعلق ہونا بھی نہیں چاہئے وہ ادیب کے لیے نظریے کے سہارے کے حامی ہیں۔وہ ادب کو ذاتی آسودگی کی شئے نہیں سمجھتے اسے سماج میں افادی حیثیت میں بھی دیکھنا چاہتے ہیں وہ طبقاتی کشمکش اور سماجی حقیقت نگاری کے مدنظر تخلیق کئے گئے ادب کو ہی مفید تصور کرتے ہیں۔یہاں بھی وہ کسی ایک شئے یعنی مقصدیت یا فنی محاسن پر زور نہیں دیتے وہ دونوں کے امتزاج سے ایک درمیانی راہ نکالنے پر اصرار کرتے ہیں۔یہی بیچ کا راستہ توازن اور اعتدال کا راستہ ہوتا ہے۔عبدالعلیم ادبی حسن کاری اور مقصد برآری کو ایک دوسرے کا حصہ قرار دیتے ہیں۔وہ رقم طراز ہیں:

> ''تجربے اور مشاہدے سے یہ ثابت ہوتی ہے کہ حسن اور افادہ کا باہمی تعلق بہت گہرا ہے اور دونوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا ہے حسن کے لیے یہ لازمی ہے کہ وہ افادہ میں تبدیل ہو سکے اور وہی چیز زیادہ حسین ہے جو زیادہ مفید بھی ہو۔اگر کوئی چیز انسانی زندگی سے تعلق نہیں

رکھتی تو اس میں حسن کا عدم اور وجود برابر ہے۔''[1]

مندرجہ بالا اقتباس کی رو سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ادب میں نہ صرف مقصدیت ضروری ہے اور نہ صرف حسن کاری۔ دونوں کا رشتہ چولی دامن کا رشتہ ہے۔ جہاں ہیئت اور مواد کے باہمی رشتے کا تعلق ہے وہ بابت وضاحت کرتے ہیں کہ ان دونوں میں گہرا اور مضبوط رشتہ ہے اور دونوں کو ایک دوسرے سے علاحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ انہیں صرف تجزیہ اور محاسبہ کرتے وقت الگ الگ کرتے دیکھا جاسکتا ہے لیکن تخلیقی مرحلے کے دوران دونوں باہم پیوسط ہوتے ہیں۔ ان کا موقف ہے کہ محض ہیئت پرستی قابل قبول اور مستحسن نہیں بلکہ مواد پر مرکوز رہنا چاہئے۔ کیونکہ ادب اور آرٹ کی مختلف ہیئتوں اور اس کے آغاز وارتقا کو سماجی تاریخ اور اس کی ترقی کی روشنی میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس لئے یہ ہیئتیں خود بخود منصۂ شہود پر نہیں آتیں بلکہ وقت اور ضرورت کے حساب سے راہ پاتی رہتی ہیں۔ اس بابت ان کا خیال ہے:

''ترقی پسند ادیبوں کے لئے اسلوب اور طرز ادا کا سوال موضوع سے اس طرح وابستہ ہے کہ ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اگر وہ خیالات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانا چاہتے ہیں تو ان کو چاہئے کہ ادب کے مسلمہ اصولوں کا استعمال اس وقت تک نہ کریں جب تک وہ ناموزوں نہ ثابت ہو جائیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ادیبوں کو نئے

---

[1] اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک۔ خلیل الرحمٰن اعظمی۔ صفحہ۔ ۳۱۰

اسلوبوں سے دور رہنا چاہئے بلکہ یہ کہ ان کے اسلوب کو موضوع کا پابند ہونا چاہئے۔ اور اس بات کی ہمیشہ احتیاط رکھنی چاہئے کہ نئے اسالیب کے گورکھ دھندے میں کہیں ان کا مقصد اور مطلب ہی نہ خبط ہو جائے۔ نت نئے اسلوب کی تلاش درحقیقت ایک طرح کی خود پرستی اور انفرادیت پسندی ہے۔ جس سے ترقی پسند ادیب کو بچنا چاہئے۔''[1]

ڈاکٹر عبدالعلیم کا موقف ہے کہ انفرادی زندگی پر اجتماعی زندگ کو ترجیح حاصل ہونی چاہئے۔ وہ انسان کو انسان اسی وقت مانتے ہیں جب وہ سماج کا حصہ ہو اگر وہ معاشرے سے الگ ہے تو اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس لئے ان کا اس بات پر زور ہے کہ ادب کا موضوع بیشتر ہمارا سماج اور سماجی مسائل ہونے چاہئیں۔ وہ گرچہ ادب کو اجتماعیت کا ترجمان دیکھنا چاہتے ہیں لیکن وہ اس امر پر متشدد مارکسی نقادوں سے Differ کرتے ہیں کہ ماضی کے ادب کو دریا برد کر دینا چاہئے۔ وہ قدیم ادبی ورثے کی قدر و قیمت اور ان کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں اس ضمن میں وہ مارکسزم کے بانیوں مثلاً مارکس، اینگلز اور لینن کی تحریروں کی مثالیں دے کر ثابت کرتے ہیں کہ ان مفکرین نے بھی ماضی کے ادبی سرمایوں کو رد نہیں کیا ہے اور نہ ہی ادب میں فنی محاسن کو معیوب ٹھیرایا ہے۔ وہ آرٹ اور فن کے ساتھ جدلیاتی مادیت کے نظریے کو پیش کرنا چاہتے ہیں اور وہ اس لئے کہ کوئی بھی نظریہ اپنی تہذیب اور روایت سے منکر ہو کر

---

[1] اردو ادب کے رجحانات پر ایک نظر۔ ڈاکٹر عبدالعلیم۔ ص۔ ۲۵

پائیدار اور بمعنی نہیں ہوسکتا ہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر عبدالعلیم نے لکھا ہے:

''مارکسزم کے بڑے نمائندوں نے ہمیشہ انسانیت کے قدیم تہذیبی ورثے کو عزت کی نظر سے دیکھا ہے اور برابر اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ کوئی اتفاقی امر نہیں ہے کہ مارکسزم کے معماروں نے قدیم ورثے کی حفاظت کو اپنا فرض سمجھا ہے۔ جمالیات میں قدیم ورثے کو عزت کی نظر سے دیکھنے کی وجہ یہ ہے کہ مارکسزم کے اصلی نمائندے تاریخ کی حقیقی شاہراہ کو نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں۔ ہر اتار چڑھاؤ پر نظر رکھتے ہیں۔''[1]

مندرجہ بالا اقتباس سے ہمیں ڈاکٹر عبدالعلیم کی سوچ اور فکر کے معیار کا اندازہ ہوتا ہے۔ اپنی تحریروں میں اکثر مقامات پر انہوں نے اس بات کا عندیہ دیا ہے کہ ادب بہت ہی قیمتی شے ہوتا ہے اس لئے اس کی تخلیق کے دوران اشتعال، نظریہ سازی اور تفریح مقاصد نہیں ہونا چاہئے۔ اسی طرح تنقید بھی بہت ہی ذمہ داری کا کام ہے۔ ایک تنقید نگار کو ہمیشہ جذباتیت، قطعیت اور شدت پسندی سے گریز کرنا چاہئے۔ اور متوازن اور معتدل رویے کے ساتھ اپنی فضا ہموار کرنی چاہئے۔ جس سے ادب کی صحیح معنوں میں تفہیم ہو سکے۔ نیز یہ بھی کوشش ہونی چاہئے کہ ادب محض تفریح کا سامان نہ ہو کر رہ جائے بلکہ اس سے سماج اور معاشرے کا بھلا ہو اور افہام و تفہیم کی نئی اور صحت مند روایت قائم ہو۔

---

[1] اردو ادب کے رجحانات پر ایک نظر۔ ڈاکٹر عبدالعلیم۔ ص۔ ۲۵

ممتاز حسین:

ممتاز حسین ترقی پسند ناقدین میں حد درجہ اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے نظریات کی عکاسی ان کی کئی کتابوں میں موجود ہے۔ نقد حیات، نئے تنقیدی گوشے، نقد حرف وخیال، جیسی تصنیفات انہیں ممتاز ثابت کرنے کیلئے کافی ہیں ان کے یہاں ترقی پسند نظریے کی سہل اور مدلل وضاحت کا عمل دخل نظر آتا ہے۔ انہوں نے مارکس کے جدلیاتی مادیت اور اردو کی قدیم شاعری بالخصوص متصوفانہ شاعری کو اپنا خاص موضوع بنایا ہے۔ ان کے مزاج ومنہاج اور طرز تنقید کے متعلق پرفیسر محمد حسن رقم طراز ہیں۔

> ''ممتاز حسین نے کلاسیکی ادب کا نئے انداز سے جائزہ لیا ہے اور ادب کی فکری اور جذباتی بنیادوں کو سماج کے بدلتے ہوئے منظر نامے کے ساتھ سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ممتاز حسین نے خاص طور پر قدیم اردو شاعری میں تصوف کی فکری اہمیت وراس کے معاشی محرکات پر توجہ کی۔ ان کا کہنا ہے کہ ادب میں جو تصورات اور اقدار ابھرتے ہیں ہ دراصل مختلف طبقوں کے باہمی ٹکراؤ سے پیدا ہوتے ہیں اور اس ٹکراؤ سے جو تبدیلی پیدا ہوتی ہے اس کے اچھے اور برے دونوں پہلوؤں کو سمجھنا چاہئے۔ تصوف اپنے دور میں سماجی احتجاج کی آواز ہے۔''[1]

---

[1] اردو تنقید کے معمار۔ ڈاکٹر محمد حسن۔ ماہنامہ آواز۔ شمارہ ۲۴

ممتاز حسین کے مندرجہ بالا اقتباس سے ان کے تنقیدی تصورات کی بابت آگاہی ہوتی ہے۔ وہ اپنے نظرے کی وضاحت جس خوش اسلوبی سے کرتے ہیں وہ قابل توصف ہے۔ وہ اختر حسین رائے پوری، مجنوں گورکھپوری، سجاد ظہیر عبدالعلیم، عزیز احمد اور احتشام حسین کے بعد ترقی پسند تنقید کے حوالے سے بہت ہی اہمیت کے حامل نقاد ہیں انہوں نے تری پسند نظریے کو شوقیہ یا عجلت میں نہیں اپنایا بلکہ کافی غور وفکر اور مطالعے کے بعد انہوں نے اس میدان میں قدم رکھا۔ وہ اپنی تنقیدات میں ادب وتنقید کے بنیادی نکات اور مسائل پر خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ ان کا انداز منطقی، سائنسی اور استدلالی ہے۔ وہ مارکسی افکار کو بہت ہی عمق اور بصیرت کے ساتھ پیش کرتے ہیں وہ چونکہ ایک مارکسی نقاد ہیں اس لئے اپنی تنقید میں اس کے اصول اور طرفکر پر روشنی ڈالتے ہیں ان کے یہاں انتہا پسندانہ یا جذباتیت والا انداز نہیں وہ اکثر مقامات پر بہت ہی سنجیدہ متین نظر آتے ہیں ان کے یہاں علمی گفتگو کا ماحول ہے۔ وہ مغربی ادبیات سے بھی آگاہ ہیں اس لئے مغربی اور مشرقی ادب کے مطالعے کے پیش نظر جو نتائج اخذ کرتے ہیں وہ نہ صرف قابل قدر ہوتے ہیں بلکہ بہت حد تک قابل قبول بھی ہوتے ہیں۔ ان کے ان اوصاف کو ان کے معترضین بھی مانتے ہیں اور ان کے علمی اور ادبی مرتبے اور ان کی خدمات کے معترف نظر آتے ہیں۔ ممتاز حسین کا ایک بڑا خاصہ ہے کہ انہوں نے بھیڑ کا حصہ بننے سے گریز کیا۔ انہوں نے ترقی پسند ناقدین کے ان عیوب سے اپنے آپ کو بچایا جن عیوب نے بہت سے ناقدوں کو علمی انداز سے ہٹا کر سیاسی انداز اور راہ کا خوگر بنا دیا۔ انہوں نے انتہا پسند ناقدین کی تحریروں سے اختلاف کیا اور ان کے اس رویے کے خلاف لکھا بھی

ثبوت کے طور پر ان کا مضامین ''ماضی کے ادب عالیہ'' موجود ہے۔ جس کے ذریعے ممتاز حسین نے متشدد ترقی پسندوں پر نہ صرف وار کئے ہیں بلکہ کسی بھی نظریے یا فکر کی تشہیر کے لئے سستی اربھونڈی سرگرمیوں کو سرے سے رد بھی کیا۔ یہ ان کا متوازن اور اعتدال پسند ذہن تھا جس نے غور وفکر کیلئے طریقے اور نئے انداز کو راہ دیا۔ اس ضمن میں شہزاد منظر نے لکھا ہے کہ:

> ''ممتاز حسین ان ترقی پسند اور مارکسی مصنفین میں سے تھے جنہیں اگر لبرل اور آزاد خیال نقاد کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ کسی ادیب کو ترقی پسند اور مارکسی کہنے کے ساتھ لبرل اور آزاد خیال کہنا بادی النظر میں غلط اور متضاد نظر آتا ہے لیکن ممتاز حسین کے بارے میں یہ بات قطعی درست ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ ایک ترقی پسند اور مارکسی نقاد تھے لیکن وہ کبھی تنگ نظر اور متعصب نہیں رہے۔ انہوں نے مارکسزم کو نظریے کے طور پر قبول ضرور کیا لیکن کبھی کمیونسٹ پارٹی کی رکنیت قبول نہیں کی۔ ان کی ادبی زندگی کا بہت ہی مختصر سا عرصہ ایسا گزرا جب وہ ترقی پسندی کی انتہا پسندی کے دور میں گمراہی کا شکار ہوئے لیکن انہوں نے خود کو بہت جلد اس بھنور سے نکال لیا اور ادب کے بارے میں ترقی پسندوں کے بعض نظریات سے واضح اختلاف کیا۔''[1]

---

[1] پاکستان میں اردو تنقید کے پچاس سال۔ شہزاد منظر۔ منظر پبلی کیشنز، گلشن اقبال کراچی۔ ۱۹۹۶ء، ص۔ ۸۹

محولہ اقتباس سے ممتاز حسین کے مزاج اور ترقی پسند تحرک سے ان کی وابستگی کی نوعیت سمجھ میں آتی ہے۔ انہوں نے جب میدان نقد میں قدم رکھا تھا اس وقت تحریک کا عروج تھا اور انتہا پسندی اپنے شباب پر تھی۔ سردار جعفری اور ڈاکٹر عبدالعلیم جیسے ذی ہوش نقاد قلم کے بدلے تلوار تھامنے کی بات کر رہے تھے۔ انہوں نے ادیبوں شاعروں کو یہ ہدایت دی تھی کہ وہ سرمایہ داروں کے خلاف صف آرا ہو جائیں اور ایسا ادب پارہ تخلیق کریں جس سے چاروں طرف انقلاب برپا ہو جائے۔ ظاہر ہے انقلاب برپا کرنے کی نیت سے خلق کیا گیا ادب شور شرابہ سے الگ کچھ نہ ہوگا۔ ایسی صورت حال میں ممتاز حسین نے نہایت ہی تدبر اور سوجھ بوجھ سے کام لیا۔ وہ اپنے پیش روؤں اور معاصرین کے برانگیختہ کرنے والی جذباتی تقریر اور تحریروں میں بہے نہیں بلکہ انہوں نے اس انتہا پسندانہ رویے کے خلاف آواز اٹھائی۔ انہوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ:

> ''میرا تعلق ترقی پسند تحریک اور انجمن سے بہت پرانا ہے لیکن میری حقیقت اس تحریک اور اس انجمن میں ایک ناقد کی بھی رہی ہے۔ یعنی میں نے ترقی پسند کے بہت سے ایسے خیالات کو جن کو میں غلط تصور کرتا ہوں بے نقاب بھی کرتا رہا ہوں اور میرا یہ رول اس تحریک میں بہت نمایاں رہا ہے۔ یہاں میں یاد دلاتا چلوں کہ جب بھیمری کانفرنس کے بعد علی سردار جعفری نے یہ نعرہ دیا کہ دوستو! قلم پھینک دو، تلوار اٹھالو، میں نے اس

کے خلاف مضمون لکھے۔''[1]

ممتاز حسین نے درج بالا اقتباس میں علی سردار جعفری کو کوٹ کیا ہے جبکہ اس سے قبل بھی اس طرح کے پرتشدد خیالات کا اظہار ہوتا رہا ہے۔ اس نوع کے اظہار کی داغ بیل اختر حسین رائے پوری کے ہاتھوں ہی پڑ چکی تھی۔ انہوں نے اپنے مضمون ''ادب اور زندگی'' میں اردو کے ساتھ تمام ہندستانی زبانوں نے ان ادب پاروں کو ملعون قرار دیا جو روایتی تھے۔ انہوں نے ایسے تمام ادب پاروں کو سرمایہ داروں کی زبان کہا اور انہیں غریبوں مزدوروں کے استحصال کا ذریعہ ثابت کیا۔ اختر حسین رائے پوری نے جو شوشہ چھوڑا تھا اس کے اثرات بعد کے زمانے میں علی سردار جعفری، ظ۔ انصری، بیدی وغیرہ کے یہاں در آیا۔ اس انتہا پسندانہ رویے کے خلاف سجاد ظہیر، احتشام حسین اور قمر رئیس اور محمد حسن جیسے معتدل مزاج نقادوں نے لکھا اور ماضی کو فراموش کر دینے کے موقف کی پرزور مخالفت کی۔ اس موقع سے ممتاز حسین نے بھی اپنے خیالات کی وضاحت کی۔ وہ رقم طراز ہیں:

> ''مارکسی تنقید میں اقتصادی بنیاد کی اولیت اور طبقاتی جنگ ادبی جانچ پڑتال کا بہترین آلہ ہے لیکن جب اس آلے کو باقاعدہ تمام حالات اور علوم کا جائزہ لئے بغیر میکانکی طور پر استعمال کیا جاتا ہے تو یہی آلہ دشمنی اور جہالت کا حربہ بھی بن جاتا ہے۔ اشتراکی انقلاب سے پہلے اور بعد

---

[1] پاکستان میں اردو تنقید کے پچاس سال۔ شہزاد منظر۔ ص۔ ۹۰

میں نہ صرف روس ہی میں بلکہ اینگلز اور مارکس کے زمانے میں خود جرمنی میں ایسے ناقدین موجود تھے جو مارکس ازم کو ایک میکانکی علم بنا کر ماضی کے ادب کو جانچنے کی کوشش کرتے تھے۔ ایسے مواقع پر مارکس اور اینگلز دونوں نے ہی اپنا قلم اٹھایا ہے۔ اسی طرح لینن نے ہر زہ گو معلموں کے خلاف نہ صرف بہت کچھ لکھا ہے بلکہ عملی تنقید کے ذریعے ہماری رہنمائی بھی کی ہے..... غلامی کے عہد سے لے کر سرمایہ دارنہ نظام تک طبقاتی شعور کی مختلف منزلیں رہی ہیں۔ اگر آج کے دور میں طبقاتی جنگ میں ہم غلامی کے عہد یا جاگیر دارانہ نظام کے ادب کو جانچنے کی کوشش کریں گے تو وہ ہمیں حقیر معلوم ہوں گے۔ ایسی صورت میں انکی معنوی افادیت کو ابھار کر ان کے جمالیاتی حظ کو بالکل ہی دبا دینا ظلم کے برابر ہے۔''[1]

ممتاز حسین نے نظری تنقید اور علمی تنقید دونوں میں کثیر تعداد میں نمونے چھوڑے ہیں۔ ان تصنیفات کے مطالعے سے ان کے تصورات اور ادب وفن کے متعلق ان کی سوچ کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ وہ تنقید کے اصل منصب سے واقف تھے۔ ان کے نظریات بہت واضح مدلل اور ہمہ گیر ہیں۔ وہ ادب اور معاشرے کے باہمی رشتے کے منکر نہیں لیکن ان کی دانست میں ادب اور آرٹ کا ایمان دارانہ محاسبہ اسوقت ہوسکتا

---

[1] نئے تنقیدی گوشے۔ ممتاز حسین۔ ص۔ ۶۷

ہے جب نقاد ادب کے علاوہ دوسرے علوم مثلاً تاریخ فلسفہ اور سائنس وغیرہ سے بھی شغف رکھے، تبھی جا کر اس کی نظر میں وسعت اور تحریر میں ہمہ گیری پیدا ہو سکتی ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

''ادبی تنقید کے معیار کو اس وقت تک بلند نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ

ہم ادب کے ساتھ ساتھ تاریخ، فلسفہ اور سائنس کا بھی مطالعہ نہ کریں۔''[1]

ان کے مطابق ادب چونکہ زندگی کا ہی عکس ہوتا ہے اس لئے اس میں لامحالہ زندگی کسی نہ کسی طور پر آ ہی جاتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم صرف زندگی کی خارجی سطحوں تک ہی محدود ہو کر رہ جائیں۔ اور ہمارے جو قدیم ادبی اور شعری محاسن ہیں انہیں ادب کیلئے مضر سمجھنے لگیں اس لئے کہ ادب سے حسن غارت ہو جائے اور اس کی ہیئت غائب کر دی جائے تو وہ ادب ادب نہ ہو کر کچھ اور ہو جائے گا۔

اس طرح مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ ممتاز حسین نے اردو کے ترقی پسند ناقدین کے دوران اپنی مثبت، تعمیری اور استدلالی انداز سے ایک نئی روش کو رائج کیا اور یہ نئی روش کسی نظریے یا موقف کی مخالف ہو تو ادب اور ادبیت کے مخالف ہرگز نہیں تھی۔

علی سردار جعفری:

ترقی پسند ناقد پروفیسر علی احمد فاطمی نے علی سردار جعفری کی تنقید نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

---

[1] نئے تنقیدی گوشے۔ ممتاز حسین۔ ص۔ ۸۶

''ان کا تخلیقی وتنقیدی ذہن، جس طرح تہذیب انسانیت کے سرچشمے، انسانی ہاتھوں کے کرشمے، حیات وکائنات کے کارنامے، آزادی و تبدیلی، ترقی اوران سب کے بطن سے انسانیت کے فلاح و بہبود کے راستے تلاش کرتا ہوا جس طرح یورپ، ایران وعرب، ہندستان کی تہذیبوں کی رنگا رنگی اوراس کی وحدت کو تلاش کرتا ہوا ایک طرف حافظ، گوئٹے، اقبال وغیرہ دوسری طرف رومی، کبیر، گرونانک، ٹیگور وغیرہ تیسری طرف پابلونرودا، ناظم حکمت، نذرالاسلام اور جوش وغیرہ کو مختلف لڑیوں میں پروتا چلا جاتا ہے..... وہ سردار کی اصل شناخت کا زبردست مظہر بنتا ہے اور جس طرح وہ دنیا کے مظاہر دنیا کے انقلابات اوردنیا بھر کے شاعروں اور فنکاروں کے حوالے سے شاعروں کو پرکھنے اور پیش کرتے چلے جاتے ہیں وہ ان کو عام شاعروں ونقادوں کی صف سے بہت اوپر اٹھا کر ایک عظیم مفکر اور دانشور کی صف میں لا کھڑا کر دیتا ہے اور وہ اردو کے ترقی پسند نقادوں کی صف سے اٹھ کر اپنی تاریخی بصیرت تہذیبی شعور اور بے مثال انسان دوستی کی سرشاری انہیں اردو کی ترقی پسند فکر ودانشوری کی عظیم روایت سے جوڑتا ہے جہاں غالب، اقبال، سجاد ظہیر، سبط حسن جیسے دانش ورنظر

آتے ہیں.....کیا سردار جعفری کی محض یہ انفرادیت ہی انہیں ہمیشہ زندہ

رکھنے کیلئے کافی نہیں ہے؟''[1]

محولہ اقتباس علی سردار جعفری کی ۸۰ویں سالگرہ پر ممبئی میں سیمینار میں پڑھے گئے ایک مضمون سے ماخوذ ہے۔ جسے فاطمی صاحب نے اپنی کتاب کے اخیر میں شائع کیا ہے۔ اس اقتباس میں مضمون نگار نے علی سردار جعفری کی ترقی پسند فکر کو بے مثال انسان دوستی کی سرشاری سے جوڑا ہے۔ اوران کی تنقیدی نگارشات کو غالب، اقبال، سجاد ظہیر اور سبط حسن جیسے دانشوروں کی توسیع سے تعبیر کیا ہے۔ یہاں جذباتیت کا عنصر موجود ہے۔ لیکن جعفری کی شاعری اور تنقید سے ترقی پسند فکر کے اوصاف کو جوڑ کر دیکھا جاسکتا ہے۔ علی جعفری، مجنوں، عزیز احمد، احتشام حسین وغیرہ سے الگ بالکل کمٹڈ نقاد ہیں اور ترقی پسند نظریات کی پیش کش کے دوران وہ کسی سمجھوتے کے قائل نہیں۔ اور یہاں تک کہ وہ ترقی پسندی کو سیاسی حقائق کے قریب تک لے جانے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ ان کی تصنیف ''ترقی پسند ادب'' کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ادبی تاریخ اور سماجی احوال پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شعر و ادب کی تخلیق کے دوران وہ چند امور کو ضروری سمجھتے ہیں۔ اوران پر کار بند ہوکر ہی کوئی ادیب یا فنکار افادی، بامعنی اور انسان دوست ادب تخلیق کرسکتا ہے۔ وہ ادب اور تنقید کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے واضح کرتے ہیں کہ وہ زمانے کا ادراک سماج کے مزاج سے بیگانہ ہوکر کوئی رول ادا نہیں کرسکتا وہ

---

[1] ترقی پسند تحریک سفر در سفر۔ علی سردار جعفری۔ ادارہ نیا سفر، الہ آباد، ۲۰۰۶۔ ص۔ ۱۸۰۔۱۷۹

عشق ومحبت کو سماجی زندگی سے ہی وابستہ قرار دیتے ہیں۔ اور سماجی زندگی سے انحراف کر کے کسی عشق یا محبت کا ذکر عبث سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شاعر اگر اپنے عہد کی باریکیوں سے بے خبر ہے تو وہ خواہ کتنی ہی حسین اور دلکش شاعری کر لے اس کا اثر پیدا ہونا مشکل ہے۔ اس لئے شعرا ادبا کا فرض ہے کہ وہ سماجی زندگی کو بنانے اور سنوارنے کی سعی کرے۔ وہ صاف طور پر کہتے ہیں کہ شاعر کو یہ طے کرنا چاہئے کہ وہ ترقی پسند عناصر کا حامی ہے یا رجعت پسندوں کا۔ یعنی خارجی زندگی اور اجتماعی شعور کو پس پشت رکھ کر کوئی بھی ادب یا فن پنپ نہیں سکتا۔ ادب کو زندگی میں بہتری لانے کے متعلق کوشاں ہونا چاہئے۔ وہ زندگی اور اس کائنات کے تمام حقائق کو فن کے سانچے میں ڈھال دینے کو ہی ادب تصور کرتے ہیں۔ ان کے مطابق اچھا آرٹ وہ ہے جس میں شعور وآگہی کی گہرائی، جذبات کی شدت اور تخیل کی بلند ہو، وہ شعور جو سیاسی حقائق کا صحیح ادراک نہ رکھتا ہو اور سچے جذبات کا ترجمان نہ ہو وہ کسی کام کے لائق نہیں۔ وہ ادب اور فن کو انسان کی زندگی پر مرکوز رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ مزید کہتے ہیں سماجی زندگی اور اس کی کشمکش سے علاحدہ ادب کی تخلیق کا کوئی مطلب نہیں۔

ترقی پسند نقادوں میں علی سردار جعفری کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے اردو میں ترقی پسند اور تنقید کے بنیادی تصورات، مقاصد اور نظریے کی وضاحت بہت صراحت کے ساتھ کی ہے۔ ان کے یہاں تمام نظریات وخیالات اشتراکی اور مارکسی نقطہ نظر کے تابع نظر آتے ہیں۔ اور وہ اسی پیمانے پر ادب پاروں کو پرکھتے ہیں۔ ان کی تنقیدی تحریروں سے ان کے شعور اور نظریاتی اصول وضوابط کی بابت علم ہوتا ہے۔ علی

سردار جعفری کے یہاں اکثر نقادوں نے قدیم وجدید ادب کے تجزیے اور تفہیم کے دوورن مارکسی نقطہ نظر کی شدت کو محسوس کیا ہے۔ وہ لینن کے خیال کہ ادب طبقاتی جنگ کا ایک آلہ ہے کے حامی ہیں اور اسی کے پیش نظر ادب کو دیکھتے ہیں۔ نتیجتاً اکثر مقامات پر ان کے یہاں انتہا پسندی آجاتی ہے۔ اور یہ انتہا پسندی اختر حسین رائے پوری سے جاملتی ہے۔ انہوں نے اقبال ، حالی، اختر شیرانی سے لے کر پریم چند ،عصمت، منٹو اور ن۔ م۔ راشد تک سبھوں کے ادبپاروں کو مارکسی کسوٹی پر پرکھنے کا کام کیا ہے۔ ان مباحث میں وہ اکثر شدت اور قطعیت کا شکار نظر آتے ہیں۔ توازن اور اعتدال کی کمی نظر آتی ہے۔ ان کا ایک مضمون ''جدید اردو ادب اور نوجوانوں کے رجحانات'' ہے۔ جو علی گڑھ میگزین میں ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں بھی ان کے تنقیدی نظریات بہت ہی واضح طور پر ظاہر ہو کر سامنے آئے ہیں۔ اور مارکسی نظریے سے ان کی ذہنی وقلبی وابستگی کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ اس مضمون پر اختر حسین رائے پوری کا عکس صاف جھلکتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ان کی کچھ خصوصیات ایسی ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے ادب کو اپنی خاص تنقیدی نگاہ سے دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ مارکسی نظریات اور اس کے اصول وضوابط کو عام کرنے میں ان کا بھی اہم کارنامہ ہے۔ ''ترقی پسند ادب'' ان کی ایک ایسی تصنیف ہے جس کے ذریعے انہوں نے ترقی پسند ادبا اور شعرا کے ادب پاروں اور ان کے ادبی کارناموں کا عملی جائزہ لیا ہے۔ اور تعین قدر کا کام انجام دیا ہے۔

''ترقی پسند ادب'' کے علاوہ اردو تنقید میں ان کے مضامین میں کبیر بانی، دیوان غالب اور دیوان

میر کے وہ مقدمے ہیں جن میں علی سردار جعفری بہت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ سائنٹفک تنقید کا نمونہ فراہم کیا ہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر مخمور صدری رقم طراز ہیں:

''.....جعفری کے قابل قدر مضامین ''کبیر بانی' دیوان غالب اور دیوان میر'' کے مقدمات میں جن میں انکے تنقیدی افکار و خیال میں وضاحت اور توازن ہے اور جو سائنٹفک تنقید کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ان مقدمات میں انہوں نے عملی طور پر جس اصول پر زور دیا ہے وہ فنکار یا ادیب کے نظریات اور عقائد کو دیکھنا اور اس کے ماخذوں کا مطالعہ کرنا ہے کبیر بانی کے مقدمے میں انہوں نے اس زمانہ کے سماجی حالات، بھگتی تحریک کبیر کے عوامی رشتہ اور انسان دوستی کے جذبات کا بھرپور تجزیہ کیا ہے۔ان کے یہ مقدمات بقول شارب ردولوی ''اردو تنقید کے سرمایے میں اہم ہیں۔اور وہ اردو میں سائنٹفک تنقید اور ترقی پسند نظریے کی نشو ونما میں معاون ہیں۔

علی سردار جعفری ادب وفن کی مارکسی اور اشتراکی قدروں کے قائل ہیں۔انکے تنقیدی شعور کی بنیاد ترقی پسند تنقیدی اصولوں پر قائم ہے۔وہ ادب کو عوام الناس کی چیز سے تعبیر کرتے ہیں۔جو ماورائیت اور الہامی

عناصر کے برعکس مادی حقائق اور جدلیاتی حرکت وتغیر کی بنیادوں کے مابین وجود ج میں آتا ہے۔ اور ارتقا پذیر ہوتا ہے۔ جس کی تخلیق عالم بالا کی مخلوق کے ہاتھوں سے نہیں خود عوام کے ذریعہ ہوتی ہے۔ عوام ہی ان کے نزدیک ادب کے ہیرو ہیں اور ادب وفن کے محرک بھی۔ سردار جعفری ادب وفن کی عوامی قدروں پر بے انتہا زور دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک عوام سے دوران کی ضرورت سے بیگانگی، ادبی تخلیق کو نامکمل اور تشنہ رکھتی ہے۔''[1]

اس ضمن میں علی سردار جعفری کا مندرجہ ذیل اقتباس ان کے موقف اور نظریے کی وضاحت میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں

''قدیم یونانیوں نے کہا تھا کہ صرف دیوتا اور شاعر تخلیق کرتے ہیں۔ آج ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ صرف مزدور (عوام) اور شاعر (ادیب وفنکار) تخلیق کرتے ہیں۔ اگر ہمارا اور انکا اتحاد نہیں ہوا تو ان کی تخلیق نامکمل رہ جائے گی۔ اور ہماری تخلیق بھونڈی اور جھوٹی ہوگی۔''[2]

علی سردار جعفری سوسائٹی کو بدلنے کے خواہاں ہیں۔ اور ادب کا تعلق براہ راست عوام سے جوڑنا

---

[1] اردو میں ترقی پسند تنقید۔ مخمور صدری۔ ص۔ ۲۷۷

[2] ترقی پسند ادب۔ علی سردار جعفری۔ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ۔ ۱۹۵۷۔ ص۔ ۶۷

چاہتے ہیں۔ وہ اس یا ان ادب پاروں کی وقعت اور اہمیت سے یکسر انحراف کرتے ہیں جو فراری مزاج رکھتے ہیں۔ اور عوام کے بدلے رجعت پسند اور بورژوا طبقے کے ترجمان لگتے ہیں ایسے ادب پاروں کو وہ محض تعیش پسندی اور تفریح طبع سمجھتے ہیں۔ ادب میں مقصدیت کے واضح اور تعمیری مقصد کے تحت دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے مطابق ادبیات عالم کے وہی ادب پارے پائیدار، دیر پا اور مقبول ثابت ہوئے ہیں جنہوں نے عوام کو اہمیت دی ہے۔ عوام کے مسائل اور ان کے مصائب کو موضوع بنایا ہے۔ مزدور، محنت کش اور مستحصل طبقے کی ترجمانی کی ہے۔ جعفری ادب میں جمالیات کے مخالف نہیں لیکن وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ صرف جمالیات کی پیش کش ہی ادب نہیں ہے ادب وہ ہے جو زندگی کی ہر جدوجہد میں شریک ہو اور اپنے معاشرے کا سچا ترجمان ہو۔ وہ ادب کا بنیادی ڈھانچہ معاشی اور اقتصادی روابط میں تلاش کرتے ہیں۔ اور سامراجی قوتوں کو اپنا ہدف بناتے ہیں۔ وہ ادبا شعرا سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ عوام کی زندگی میں مثبت اور تعمیری امکانات تلاش کرنے میں معاون ہوں۔

علی سردار جعفری کے یہاں بھی ہیئت، موضوع اور مواد کی بحث ہے۔ اس کے متعلق کا موقف ہے کہ ہیئت اور مواد دونوں کے درمیان ایک ہم آہنگی اور توازن کا عمل دخل ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر نامکمل رہیں گے۔

مختصرہ کہ علی سردار جعفری نے شاعری کے علاوہ اردو کے مارکسی نقادوں میں اپنی قطعیت اور صاف گوئی (جسے انتہا پسندی بھی کہہ سکتے ہیں) کے لئے بھی خاصے مقبول ہیں۔ اور اسی طور سے ہی سہی ان کی

بصیرت اور آگہی سے بھرپور تنقیدی نگارشات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

ڈاکٹر محمد حسن:

اردو کے مارکسی تنقید نگاروں میں پروفیسر محمد حسن کا نام بہت معروف اور مقبول ہے۔ محمد حسن یوں تو ایک ڈرامہ نگار اور شاعر کی حیثیت سے بھی معروف رہے ہیں لیکن بنیادی طور پر مارکسی نقاد ہیں۔ پروفیسر احتشام حسین کے بعد محمد حسن ایک ایسا اہم نام ہے جس نے مارکسی نظریات کی تعبیر و تشریح میں اہم کردار ادا کیا اور بہت ہی علمی، استدلالی اور معتدل انداز میں انہوں نے اس فکر کو اردو کے ادیبوں اور نقادوں کے درمیان پیش کیا۔ اس ضمن میں وہ مارکسی تنقید کی تفہیم کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''مارکسی تنقید دراصل فن اور زندگی کے باہمی رشتوں کی نگراں ہے۔ وہ ایک طرف ادب اور زندگی کے ربط باہمی کو نظر میں رکھتی ہے ادب زندگی پر اثر انداز ہونے کی کوشش ہی زندگی سے اثر لیتا ہے۔ زندگی کو تبدیل کرنے کے عمل میں بہتر طور پر شریک ہونے کیلئے خود کو تبدیل کرتا ہے۔ دوسری طرف مارکسی تنقید ادب کے دائرے کے اندر رہ کر اسے ایک نئے تضاد سے آشنا کرتی ہے۔ تخلیقی شہ پارے اور اس کی تنقید یعنی اس کی اندرونی ترتیب بیرونی رشتوں اور مجلس عمل کے مطالعہ کے تضاد سے۔ اور یہی وہ تضاد ہے جو ادب کو بہتر، تازہ اور شاداب تر بنانے کا ذمہ دار ہے۔ اس لحاظ سے مارکسی

تنقید ہر ادبی منزل کے اندرونی تضاد کو نمایاں کر کے اور ہر اگلی تخلیق پر اثر انداز ہو کر اپنی تخلیقی آن بان قائم رکھتی ہے۔ اور اس مقصد کو پورا کرتی ہے جو تنقید کا بنیادی مقصد ہے۔''[1]

محمد حسن کے مندرجہ بالا اقتباس سے ان کے نظریے کی سرسری وضاحت ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ وہ ایک مارکسی نقاد تھے لیکن دوسرے بہت سے مارکسی نقادوں سے وہ کئی معاملے میں ممتاز و منفرد ہیں کہ انہوں نے صرف مارکسی کی تھیوری پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ دوسرے علوم وفنون سے بھی آشنائی رکھی۔ انہوں نے مارکسی تنقید کے نظریے میں وسعت پیدا کی۔ محمد حسن نے عملی اور نظریاتی تنقید سے درجنوں مضامین لکھے اور درجن بھر سے زیادہ کتابیں تصنیف کیں۔ محمد حسن نے اپنے انداز اسلوب کی دلکشی اور منطقی واستدلالی طرز سے کام لیتے ہوئے تنقید کو Convincing نوعیت دینے کی کوشش کی ان کی نظر عالمی ادب کی بنتی بگڑتی صورت حال پر گہری تھی۔ وہ جدید وقدیم ادبی تاریخ، سماجیات اور فلسفے سے آشنا تھے اس لئے اپنے نقد پاروں میں وہ ان تمام عوامل کو پیش کرتے ہیں جو ان کے موقف کے اظہار میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ انکے یہاں متشدد مارکسی نقادوں کی طرح دعوی اور فیصلے نہیں ہوتے۔ وہ فن پارے کے حسن وقبح کو ان کے سماجی تاریخ اور تہذیبی پس نظر میں دیکھتے ہیں دوسری بڑی بات یہ کہ وہ اپنے تنقیدی مضامین میں ماضی کے ادب اور فنی محاسن کو رد نہیں کرتے۔

---

[1] ادبی تنقید۔ پروفیسر محمد حسن۔ ص۔ ۳۶

محمد حسن ادب اور زندگی کو سماج کا ایک ناگزیر جز تصور کرتے ہیں۔ اسے زندگی کے مختلف شعبوں میں اہم رول دیتے ہیں۔ وہ کسی طور بھی ادب کو محدود کرنے کی سرگرمیوں کے مخالف نہیں۔ وہ فن کی ابدیت اور آفاقیت کو لازم قرار دیتے ہیں۔ ان کے یہاں سائنٹفک انداز ہر جگہ جھلکتا ہے۔ وہ اشیا کو اس کی اصل حقیقت اور جوہر کی روشنی میں دیکھتے اور پرکھتے ہیں۔ محمد حسن مارکسی نقاد ہوتے ہوئے بھی ادب کی جمالیاتی قدروں کے مخالف نہیں وہ فکر اور فن کے امتزاج کے قائل ہیں۔ اور اسے ہی اعلی ادب کی تخلیق کا ذریعہ تصور کرتے ہیں۔ ان کے متنوع خیال اور گہری فکر نے مارکسی تنقید میں جو ہمہ گیری پیدا کی ہے وہ ایک طرح سے ترقی پسند تنقید کی توسیع کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ادبی تصنیف ''ادبی سماجیات'' میں رقم طراز ہیں:

> ''ادیب محض رپورٹر نہیں وہ محض کیمرہ کی آنکھ یا کیسٹ کا کارڈ نہیں ہے کہ جو دیکھے یا سنے اسے محفوظ کرتا جائے بلکہ اس کی اپنی داخلی اور تخلیقی حیثیت ہے اور اس میں تخیل کا ایک بڑا حصہ ہے۔ اس لحاظ سے ادب میں پیش کردہ تفصیلات کو تاریخی حقائق کا درجہ دینا اتنا ہی غلط اور گمراہ کن ہوگا جتنا ادب کے فنی پہلو اور اس کی جمالیاتی بصیرتوں کو نظر انداز کرنا''

محمد حسن ادب میں مقصدیت کے قائل ضرور ہیں لیکن دوسرے مارکسی نقادوں کے برعکس فنی محاسن کے بھی قائل ہیں۔ اس ضمن میں مزید وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

---

۱ ادبی سماجیات۔ پروفیسر محمد حسن۔ مکتبہ جامعہ لمٹیڈ۔ نئی دہلی۔ ۱۹۸۳۔ ص۔ ۱۵

''ہمارے تنقید نگاروں کو یاد رکھنا چاہئے کہ ادب پہلے آرٹ ہے بعد کو کچھ اور۔ اس پر فن کے اصولوں کا اطلاق ہوگا۔ شاعری کا کوئی موضوع اور مقصد کیوں نہ ہو اسے سب سے پہلے اعلیٰ ادب پارہ ہونا چاہئے۔ اگر کوئی شاعری اس معیار پر پوری نہیں اترتی تو وہ کتنی ہی کامیاب اور کارآمد کیوں نہ ہو ادب میں جگہ نہیں پاسکتی۔ آرٹ کا پہلا کام جمالیاتی احساس کی تسکین ہے۔''[1]

محمد حسن کے مطابق دنیا کا ہر ادب پارہ نہ صرف اپنے گرد و پیش بلکہ اپنے ماضی سے استفادہ کرتا ہے اور ادیب انہیں امور کو پیش نظر رکھ کر انہیں اپنے حال سے مماثل کرتے ہیں اور نئے عہد میں نئی تعبیریں اور نئے حالات کو منعکس کرتے ہیں۔ ادیب اور شاعر ہر زمانے میں ذہنی کشمکش اور داخلی و خارجی واقعات و سانحات سے ادب برائے ادب کی بحث زیادہ معنی نہیں رکھتی۔ ادیب اپنے زمانے، اپنے ماحول اور اپنے سماج سے فطری طور پر جڑا ہی ہوتا ہے۔ ادب کا مقصد ایک بہتر معاشرہ اور زندگی میں اصلاح ہے اس لئے وہ اسے اجتماعی عمل سے تعبیر کرتے ہیں۔ حالانکہ اس اجتماعی عمل میں انفرادی رنگ بھی موجود ہوتا ہے۔ محمد حسن کی تنقید میں ہمیں ادب زندگی اور سماج کے مابین تعلقات کو سمجھنے میں مدد کرتی ہے۔ چونکہ انہوں نے مارکسی تھیوری کے علاوہ دوسرے علوم کا بھی عمیق مطالعہ کیا ہے اس لئے وہ کہتے ہیں کہ ادب کا اعلیٰ ترین

---

[1] فن تنقید اور اردو تنقید نگاری۔ بحوالہ نورالحسن نقوی۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔ ۲۰۰۱۔

حصہ زندگی کو براہ راست نہیں بدلتا۔ بالفاظ دیگر ادب سے معاشرے میں انقلاب نہیں آ سکتا۔ بلکہ ذہن سازی کرتا ہے اور دھیرے دھیرے ہی سہی اپنا پائیدار اور دیرپا نقش ثبت کر جاتا ہے۔

محمد حسن کے نزدیک تنقید کے کچھ اصول وضوابط ہیں جن کو ذہن میں رکھے بغیر اعلیٰ، افادی اور تعمیری تنقید ممکن نہیں۔ وہ تنقید کو ذاتی پسند و ناپسند اور ریمارکس پاس کرنے کا فن نہیں سمجھے۔ وہ علمی اور فلسفیانہ مباحث کے ذریعے بصیرت اور آگہی پر زور دیتے ہیں اور یہی بصیرت اور آگہی زندگی کو سنوارنے میں ممد ومعاون ثابت ہوتے ہیں۔ محمد حسن کے یہاں جدید وقدیم ادب کی اہمیت اور افادیت پر یکساں طور پر باتیں ملتی ہیں انہیں نہ ماضی سے اجتناب ہے اور نہ قدما کے فن پاروں سے پرہیز۔ وہ بہت ہی وسعت ذہنی اور فراخ قلبی کے ساتھ سائنٹفک ڈھنگ سے اپنی باتیں رکھتے ہیں۔ ان کی باتیں اس لئے بھی باوزن اور باوقار ہوتی ہیں کہ وہ اپنی تنقیدی تحاریر میں تحقیق، نفسیات، عمرانیات، سماجی علوم، جمالیات، تاریخ اور اقتصادیات جیسے تمام امور کو زیر بحث لاتے ہیں اور جس سے ان کی تنقید کا خمیر اٹھتا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

> ''تخلیق دراصل تین سطحوں سے ہو کر گزرتی ہے۔ وہ اپنے مصنف کی ذات کا اظہار بھی ہوتی ہے اس کے عصری شعور کی آواز بھی اور اس دور سے پیدا ہونے والی آفاقی اقدار کی گونج بھی۔ اس لئے ہر دور کے سنجیدہ ادب کا مطالعہ لازمی طور پر مصنف کا مطالعہ (تحقیق، سیرت اور نفسیات کی مدد سے) عصر کا مطالعہ (عمرانیات، اقتصادیات اور سماجی علوم سے) اور آفاقی

اقدار کا مطالعہ (جمالیات اور تاریخ کی مدد سے) بن جاتا ہے۔''[1]

محولہ اقتباس کے مدنظر محمد حسن کا نقطہ نظر ہے کہ ادب پاروں کا مطالعہ تہذیبی پس منظر کے علاوہ معاشی، عمرانی، سماجی اور تاریخی تناظر میں ہونا چاہئے۔ تب ہی جا کر اصل تنقید کا کا فریضہ ادا ہوسکتا ہے۔ وہ مارکسیت کے متعلق بتاتے ہیں کہ اس نظریے کے تحت زندگی ہمیشہ ارتقا پذیر رہتی ہے۔ تغیر و تبدل کا عمل ہمہ وقت جاری رہتا ہے۔ اب ادیب کا فرض بنتا ہے کہ وہ اس ارتقائی مراحل میں کس طرح معاون ہوتا ہے۔ اور اپنی صلاحیتوں کو کس طرح بروئے کار لاتا ہے۔ محمد حسن ادب کے مطالعے کے لئے سماجی اور تہذیبی رشتوں پر بہت زور دیتے ہیں۔ اس کے بغیر وہ ادب کو صحت منداور قابل قبول تصور نہیں کرتے۔ وہ ادب میں اسلوب، ہیئت، صوتیات اور فنی اقدار پر یکساں طور پر زور دیتے ہیں۔ عام طور سے مارکسی نقاد ہیئت کو رد کرتے ہیں جبکہ محمد حسن اس کی حمایت میں نہیں ہیں وہ مارکسی تنقید اور ہیئتی تنقید کے بیچ کی دوری کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہوں نے یہ کام پہلی مرتبہ انجام دیا۔ اور مارکسی و ہیئتی تنقید کو مفاہمت کی راہ پر لا کھڑا کیا۔ انہوں نے اس بابت لکھا ہے:

''ہیئت پر زور دینے والے نقادوں نے آہنگ و اسلوب کے تجزیے،
صوتیات کی درجہ بندی، تشبیہوں اور استعاروں کے شمار اور زباں اور پیرایۂ
اظہار کے ہر پہلو پر اس درجہ توجہ کی کہ تخلیق کے پیکر میں ڈھلنے والی روح عصر

---

[1] جدید اردو تنقید۔ اصول و نظریات۔ بحوالہ شارب ردولوی۔ ص۔ ۳۸۵

کو پہلو پر اس درجہ توجہ کے پیکر میں ڈھلنے والی روح عصر کو فراموش کر دیا اور متن مشن میں گم ہو کر رہ گئے۔ عمرانی تنقید کے رسیا نقاد نفس مضمون کی ایسی ادھیڑ بن میں لگے۔ شاعری کے دور کو پہنچے اور اس کے سیاسی اور تہذیبی عوامل و محرکات کی بحث میں چھ اس طرح محو ہوئے کہ اسکو اسلوب و آہنگ کا بدل سمجھ بیٹھے اور فن پارے کے فن اور اسلوبیاتی تجزیے سے غافل ہو گئے۔''[1]

محولہ اقتباس میں محمد حسن نے اس بات کی توضیح کی ہے کہ کوئی بھی جمالیاتی اور فنی خصوصیات سے معمور فن پارہ اپنے سماج اور معاشرے الگ نہیں ہوسکتا۔ اس لیے اسلوب و آہنگ ے خالص جمالیاتی مطالعے اور ہیئتی تجربے کی مدد سے بھی سماجی حقائق کو اجاگر کیا جاسکتا ہے۔ اور ان کے ذریعے عہد موجود کے مقہور و مظلوم انسانوں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی جاسکتی ہے۔ وہ ہیئتی تنقید کو ایک طرح سے عمرانی تنقید کا ہی حصہ یا ضمیمہ تصور کرتے ہیں۔

محمد حسن اپنی تصنیف ''مارکسزم اور ادب'' میں یہ واضح کرتے ہیں کہ مارکسی تنقید آرٹ کا کوئی بندھا ٹکا آدرش نہیں یعنی وہ شعوری طور پر کسی بھی ازم اور تحریک کے تابع ہونا پسند نہیں کرتے اور نہ ہی وہ انہیں اہمیت دیتے ہیں ان کے یہاں ایک اشیاء کو دیکھنے اور سمجھنے سمجھانے کا ایک سائنٹفک طریقہ ہے اور یہی طریقہ انہیں مثبت نتائج کی طرف لے جاتا ہے۔ اس ضمن میں شارب ردولوی ان کے انتقال کے بعد اج

---

[1] عرض ہنر (دیباچہ) محمد حسن۔ نصرت پبلشرز، لکھنؤ، ۱۹۷۷ء، ص۔ ۷۔۸

کل کے گوشے (پروفیسر محمد حسن) میں جو کچھ لکھا ہے اسے اخیر میں پیش کر کے میں محمد حسن کی تنقید نگاری کا باب یہیں پر ختم کرتا ہوں۔ ملاحظہ کریں:

''ترقی پسندی یا جدیدیت سے انکا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کے یہاں ایک سائنسی تجزیہ فکر ہے۔ وہ لہٰذا تہذیبی یا اقتصادی عوامل سے بھی تعین قدر میں مدد دیتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں اصناف ادب کے عروج و زوال کے پس پردہ بھی تہذیبی و سماجی عوامل کی کارفرمائی یا محرکات کی تلاش کی جاسکتی ہے۔ لیکن سماجیات کو مطالعہ ادب یا تنقید میں حرف آخر نہیں قرار دیتے بلکہ ان نزاکتوں پر تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں جو اس مطالعہ کے درمیان حائل ہیں۔ وہ ادبی تخلیق کو یک رخا نہیں سمجھتے انہیں علم ہے کہ تخلیقی عمل بڑا پر پیچ عمل ہے اور تخلیقی عمل میں بعض عوامل بہت خاموشی سے اثر انداز ہوتے ہیں لیکن تعین قدر کے وقت اگر ناقد اسے نظر انداز کر دے تو نتیجہ میں غلطی ہوسکتی ہے۔''[1]

---

[1] محمد حسن کی نظری اور عملی تنقید۔ شارب ردولوی۔ (گوشہ محمد حسن)

آجکل۔ نئی دہلی۔ جولائی۔ ۲۰۱۰ء۔ ص۔ ۱۰

قمر رئیس:

قمر رئیس ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔انہوں نے ادب کی کئی اصناف میں کارنامے انجام دئے لیکن ان کی تنقید نگاری کو اولیت حاصل ہے۔ابتدا میں وہ کمیونسٹوں کا ادب اور ان کے نظریات کا مطالعہ کرتے رہتے لیکن اس نظریے کے حامی نہیں ہوئے۔وہ ترقی پسندوں کے جلسوں،نشستوں میں شریک ہوتے رہے لیکن باضابطہ طور پر اس تحریک سے وابستہ نہیں ہوئے چونکہ ان کا ذہن خاصا متوازن اور منضبط تھا اس لئے وہ کمیونسٹوں کی بعض انتہا پسندیوں کو ناپسند کرتے تھے۔لکھنؤ کے زمانہ قیام میں وہ احتشام حسین ممتاز حسین علی سردار جعفری اور محمد حسن کی تحریروں سے متاثر ہوئے اور اس نظریے کے پیش نظر لکھنا شروع کیا۔وہ ادب میں مارکسی، انقلابی اور افادی تصورات کے قائل تھے۔لیکن اس شرط کے ساتھ نظریاتی شدت اور انتہا پسندی کو راہ نہ دی جائے۔یہی سبب ہے کہ ان کے اکثر مضامین میں مذکورہ اوصاف کی صاف جھلک نظر آتی ہے۔وہ علمی تنقید میں ڈاکٹر خورشید الاسلام اور محمد حسن سے بہت متاثر تھے۔انہوں نے نظریاتی سطح پر احتشام حسین،اختر انصاری اور مجنوں گورکھپوری کی تحریروں سے کسب فیض کیا۔

قمر رئیس نے اکثر اپنی تحریروں کے ذریعے اپنے نظریات اور اپنی فکر کی بابت اظہار خیال کیا ہے۔ان کے مطابق کوئی بھی ادب خواہ کسی بھی معیار اور نوعیت کا ہو،خواہ وہ کسی بھی ماحول میں تخلیق ہوا ہو اس

۱؎ اختر انصاری رومانیت سے جدیدیت تک۔وحید اختر۔

رسالہ ''الفاظ'' علیگڑھ۔مئی اگست ۱۹۸۳ء۔ص۔۱۶

میں سماج کا عکس ضرور ہوتا ہے۔لیکن چونکہ ادیب سماج کا نقشہ ہوتا ہے۔اس لئے اس کی تخلیق میں اس کی انفرادیت یا اس کی شخصیت ضرور جھلکتی ہے۔لیکن کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ ادب پارے پر شخصیت غالب آتی ہے اور ادب عقب میں چلا جاتا ہے۔اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ فن پارہ ہی ہوتا ہے اس میں ادیب کا وجود معدوم نظر آتا ہے۔قمر رئیس صاحب ان دونوں صورتوں کے درمیان توازن کو لازمی قرار دیتے ہیں۔وہ اس امر پر بھی توجہ مرکوز کرنا چاہتے ہیں کہ ادب کی تنقید کے دوران ادیب کی شخصیت اور فن پارے کے معرض وجود میں آنے کے محرکات واسباب ضرور سامنے آئیں۔اس وہ اپنے مضامین کے مجموعے ''تلاش وتوازن'' میں رقم طراز ہیں کہ:

> ''میرے نزدیک ہر ادبی تخلیق خواہ وہ کسی بھی باطنی تجربے یا داخلی حقیقت کا اظہار ہو اور اس کا پیرایہ بیان کتنا ہی نازک اور تہہ دار ہو کسی نہ کسی سماجی صورت حال کا عکس ہوتی ہے۔اور صرف عکس ہی نہیں اس پر تبصرہ بھی ہوتی ہے۔اس کی تفسیر بھی اور تنقید بھی۔اگر چہ یہاں اس حقیقت کے اعتراف میں مجھے تامل نہیں کہ شعر وادب میں سماجی عنصر ایک متحرک انسانی وجود کے واسطے سے اس کی منفرد شخصیت اور مخصوص طبعی میلانات کا جز بن کر اور فنی تخلیق کے مراحل سے گزر کر سامنے آتا ہے۔اس لئے ادب کے مطالعے میں سماجی اور تاریخی عوامل کے ساتھ فنکار کی شخصیت کے تشکیلی

عناصر اور داخلی محرکات کا مطالعہ بھی اہمیت رکھتا ہے ۔فن وادب کی روایت، ان کا تسلسل اور ان کے مخصوص ضابطے ہیں۔ سماجی نظام اور سماجی اقدار کی تبدیلی اور اس تبدیلی کے قوانین ادب کی اقدار، معیار اور اس کے قوانین کو اسی رفتار سے اور اسی حد تک بدلتے ہیں جس طرح اور جس حد تک وہ انسانی اقدار، انسانی جذبات اور محسوسات کے مجموعی اور عمومی Pattern پر اثر انداز ہوتے ہیں۔''[1]

قمر رئیس کی تنقید نگاری کا ایک بڑا وصف یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں زبان کے حسن اور شائستگی ہر جگہ موجود نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ وہ ایک تخلیق کار بھی ہیں ان کی غزلیں اور نظمیں مثالاً سامنے ہیں۔ ان کی زبان میں روزمرہ الفاظ صاف شفاف اسلوب اور سہل انداز ہر جگہ جھلکتے ہیں۔ اکثر مقامات پر ان کی تنقیدی تحاریر میں تخلیقی زبان کا استعمال ہوا ہے۔ بالخصوص فکشن پر لکھتے ہوئے قمر رئیس کا اسلوب نقد کافی پرکشش اور معنی خیز ہو جاتا ہے۔ ان کے یہاں دوسرے ترقی پسندوں کے برعکس اسلوب کی دلکشی پر زیادہ توجہ محسوس ہوتی ہے۔ ان کے اسلوب نقد کی خوبی کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید رقم طراز ہیں:

''قمر رئیس کے نزدیک اچھا اسلوب اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ

---

[1] تلاش وتوازن۔ قمر رئیس۔ خرام پبلی کیشن۔ دہلی۔ ۱۹۶۸۔ ص۔ ۹۔ ۸

کوئی فنکار سادہ اور سلیس زبان اور شفاف و بے تکلف طرز تحریر کو کام میں لاتا ہے۔ بلکہ بول چال کی عام فہم زبان کو تخلیقی زبان کا درجہ دیدیتا ہے۔ اسلوب کو تکلف، تصنع اور آرائش سے مبرا ہونا چاہئے کیونکہ سادہ اور حقیقت پسندانہ اسلوب ہی سے فکر و اظہار کی تفہیم ممکن ہے۔ قمر رئیس نے گویا صرف موضوع، مواد اور نقطہ نظر ہی پر زور نہیں دیا بلکہ پیرایہ اظہار اور طرز بیان کو بھی اہمیت دی ہے۔''[1]

قمر رئیس کی تنقید میں ایک طرح سے رواداری اور سماجی سرور کار کا سراغ ملتا ہے۔ احتشام حسین کی طرح ان کے یہاں بھی تاریخی شعور بہت بالیدہ ہے۔ وہ گرد و پیش کے معاشرے اور تہذیبی اقدار سے پوری طرح واقف ہیں۔ اسلئے وہ پرانی اور نئی قدروں کے مابین فرق کو بہت واضح طور پر محسوس کرتے ہیں اور ان کا اظہار بھی بہت سہل انداز میں کرتے ہیں۔ وہ ترقی پسند نظریے کے حامی تو ہیں لیکن ان کے یہاں نعرے بازی اور پروپگنڈہ بازی نہیں۔ ایک متانت اور علمی انداز ہے جو ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔ وہ ادب کو کسی تحریک کے منشور کی کسوٹی پر نہیں پرکھتے۔ ان کے پرکھنے کا اپنا پیمانہ ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر عتیق اللہ نے مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''وہ اپنی تنقید میں جس قدر یک سو، پر اعتماد اور مرتکز دکھائی دیتے ہیں اور

---

[1] اردو تنقید اور قمر رئیس۔ سلیمان اطہر جاوید۔ مشمولہ قمر رئیس ایک زندگی۔ ص۔ ۳۰۸

جس طرح ایک گہری متانت نیز اپنی نظریاتی توجیہات کے باوجود تخلیقی ذہانت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ان کے معاصرین میں کم ہی نظر آتے ہیں۔

ان کی تنقیدی تصورات اور نظریات کا اطلاق تو کرتی ہے مگر ان کی تشہیر یا فلسفیانہ نوعیت کے تعبیر و تحلیل کو اپنا کردار نہیں بناتی .....قمر رئیس جو کہ گزشتہ ۳۵۔۳۰ برسوں سے تنقید کے کام سے جڑے ہوئے ہیں پوری استقامت کے ساتھ تنقید کے اس رویے پر قائم ہیں جس میں تخلیق کو بنیاد بنایا جاتا ہے۔یعنی عملی تنقید ان کی تحلیل کے عمل میں نمایاں کارکردگی کی حیثیت رکھتی ہے۔

بالعموم افسانہ یا فکشن ان کی دلچسپی کا خاص موضوع ہے۔مگر ہمارے دور کے بعض اہم شعرا کے فکر و فن کے اسالیب پر ان کے مضامین شعر کی پرکھ کی بڑی عمدہ مثالیں قائم کرتے ہیں۔

.....اس طرح قمر رئیس افسانوی ادب کے پہلو بہ پہلو شاعری کی تنقید کی طرف پہلے کی نسبت زیادہ سرگرم دکھائی دیتے ہیں۔

افسانوی ادب کی تنقید قمر رئیس کا پہلا سروکار ہے۔غور طلب بات یہ ہے کہ ان دنوں جب فکشن پر لکھے ہوئے مضامین تک کا قحط تھا،قمر رئیس نے پریم

چند کو اپنی تنقید کا موضوع بنایا۔ پریم چند کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ (۱۹۵۹ء)

ان کی تخلیقی دانش اور تنقیدی بینش کی ایک قابل قدر مثال ہے۔''[۱]

ڈاکٹر قمر رئیس نے پریم چند پر بہت جامع اور وقیع تحقیق کی ہے اور اس میدان میں ان کی کتاب اولیت کا مقام رکھتی ہے۔ پریم چند کی افسانہ نگاری اور ناول نگاری پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ جامعات میں بھی ان پر متعدد کام ہوئے ہیں۔ لیکن قمر رئیس نے پریم چند پر جو بنیادی کام کیا اس کا عکس ان کے بعد کے تمام مقالوں اور کتابوں میں جھلملاتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر مسرت جہاں نے لکھا ہے:

''پریم چند اور جدید فکشن پر لکھنے والا کوئی بھی نقاد قمر رئیس کے حوالوں کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ دراصل پریم چند پر قمر رئیس کا کام اتنا وقیع اور مستند ہے اور ملک کے مختلف دانش گاہوں میں طلبہ کی کم از کم تین پیڑھیوں نے اس سے اس طرح استفادہ کیا ہے کہ ان کا امیج پریم چند کے نقاد کا امیج بن گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پریم چند سے ہٹ کر دوسرے موضوعات یا دوسرے میدانوں میں انہوں نے تحقیق اور تنقید کے جو کارنامے انجام دئے وہ بڑی حد تک نظر انداز ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے تحقیقی مقالے میں ان

---

[۱] قمر رئیس کا تنقیدی موقف اور ترجیحات۔ پروفیسر عتیق اللہ۔
مشمولہ قمر رئیس، ایک زندگی۔ ص۔ ۲۶۹۔۲۶۸

کے پھیلے ہوئے تنقیدی کارناموں کو مختلف ابواب کی تحت سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے تا کہ اردو زبان و ادب کے طلبا ان کے علمی اور تنقیدی کارناموں کی مجموعی حیثیت کا اندازہ لگا سکیں..... ایک نقاد کی حیثیت سے گزشتہ نصف صدی میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اور بتدریج اس میں ان کی تنقیدی بصیرت اور تجزیاتی قوت میں جس طرح گہرائی، وسعت اور ہمہ جہتی پیدا ہوتی رہی ہے۔اس کا جامع مطالعہ ابھی تک نہیں ہو سکا ہے۔''[1]

محولہ اقتباس کی روشنی میں درج ذیل مضامین کو مثالاً پیش کئے جاسکتے ہیں۔جن پر ابھی ادب کے سنجیدہ حلقوں میں تفصیل سے گفتگو نہیں ہوئی ہے جبکہ یہ مضامین بھی اپنے نظریے اور اسلوب کے لحاظ سے کم اہمیت کے حامل نہیں ہیں۔ یہ مضامین مختلف موضوعات پر مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں۔مضامین کے عنوانات ملاحظہ کریں:

۱۔ نیاز فتح پوری اور متوازی افسانہ۔

۲۔ جوش کی میزان اقدار میں علمی اور عقلی رویے

۳۔ بیدی کا تخلیقی ورثہ

۴۔ فیض کی غزل کا اسلوب و آہنگ

---

[1] قمر رئیس کی علمی و ادبی خدمات: تنقیدی جائزہ۔ڈاکٹر مسرت جہاں۔مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، دہلی۔ص۔۱۲۹

۵۔ اختر الایمان اور ماضی کی بازیافت

۶۔ سردار جعفری اور مارکسی تنقید

۷۔ زمین اور زندگی سے نازک رشتوں کا شاعر۔ظفر گورکھپوری

۸۔ مرزا سودا کی دولخت شخصیت

۹۔ اردو کے اولین افسانے۔ایک تحقیقی جائزہ

۱۰۔ ایک تاریخ ساز تاریخی ناول ''طوفان کی آہٹ''

ان مضامین کے عنوانات سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ قمر رئیس جو بحیثیت فکشن نقاد معروف ہوئے اور ان کی دوسری تنقیدی تحریریں پشت ہو گئیں ان کے یہاں اردو کی شعری روایت پر بھی گہری نظر ہے۔ اور وہ اپنے مضامین خواہ فکشن پر ہوں یا شاعری پر ہر جگہ اپنے عمیق مطالعے اور برسوں کی چھان پھٹک کا ثبوت دیتے ہیں۔ان کے یہاں سرسری اور سطحی تنقید کا چلن نہیں۔غور وفکر اور تجزیاتی انداز کا عمل دخل ہر جگہ دکھائی دیتا ہے۔ایک اور بہت اہم چیز جو ان کی تنقید کی اساس ہے۔ وہ ہے ان کا سائنٹفک اور عقلی نظریہ۔وہ گرچہ جمالیاتی تنقید سے بھی وابستہ رہے ہیں لیکن بعد کی تحریروں میں وہ ہر جگہ حقیقت پسندی اور گہرے سماجی شعور سے کام لیتے ہیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ قمر رئیس اخیر تک ترقی پسند تنقید کے ستون کے طور پر ایستادہ رہے جبکہ ان کے کئی پیش رو اور معاصرین قارئین اور اہل ادب کے اذہان سے محو ہو گئے۔ان کے نظریے فکر اور خیال میں زمانی اعتبار سے بھی استحکام اور پائیداری ہے۔ جو نا قابل

فراموش ہے۔ اخیر میں ڈاکٹر شارب ردولوی کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں جو اس دعوے کی دلیل کے طور پر کافی سمجھا جا سکتا ہے۔

''ڈاکٹر قمر رئیس اردو کے ان نقادوں میں ہیں جن کی تنقیدی بصیرت نے عوامل اور فنی دانوں خوبیوں سے توانائی حاصل کی ہے۔ ..... وہ سائنٹفک نقاد ہیں اور اپنی عملی تنقید میں سماجی جدلیت اور تاریخی قوتوں کے اثرات کے ساتھ فنکار کی شخصیت کے تشکیلی عناصر، نفسیاتی عوامل اور فنی حسن وقبح پر خصوصیت کے ساتھ زور دیتے ہیں۔

قمر رئیس کے نزدیک ماضی کے ادراک اور حال کی تفہیم کے بغیر فن کی اعلیٰ قدروں کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ وہ ایک محتاط نقاد ہیں اس لئے ادب کی داخلیت اور خارجیت، عصریت اور آفاقیت پر یکساں زور دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں تنقید کا اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ ادب کے سماجی رویے، اس کے گرد و پیش کے حالات، سماجی حقیقتوں اور قدروں کی تبدیلی کے قوانین کو سامنے رکھ کر ادب کی اقدار کا تعین کرے۔ اس کے بغیر نقاد کا اپنے منصب اور فریضہ سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں۔''[1]

---

[1] جدید اردو تنقید۔ شارب ردولوی۔ ص۔ ۳۸۳۔۳۸۲

سید محمد عقیل رضوی:

پروفیسر سید محمد عقیل رضوی جیسے اردو کے ترقی پسند ناقدین محتاج تعارف نہیں۔ احتشام اور ممتاز حسین کے بعد ترقی پسند تنقید میں سید محمد عقیل نے اپنی تصنیفات کے ذریعے اپنی نمایاں شناخت مستحکم کی ہے۔ ان کی تصنیفات میں ''نئی علامت نگاری عملی انتقادیات غزل کے نئے جہات سماجی تنقید اور تنقیدی عمل اصول تنقید اور ردعمل جدید ناول کا فن، تنقید اور عصری آگہی، غزل نما، وغیرہ ان کے نظریے اور طریقہ تنقید کو واضح کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ وہ بھی دوسرے مارکسی نقادوں کی طرح ادب میں مقصدیت کے قائل ہیں اور بغیر کسی مقصد اور نظریے کے ادب کی صحیح تفہیم کو ناممکن بتاتے ہیں۔ ان کے یہاں نظری تنقید کے ساتھ عملی تنقید کے بھی عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ اس سلسلے کی ان کی تصنیف انیس کے مرثیوں کا سماجی تجزیہ کافی اہم اور قابل قدر ہے۔ اس کتاب میں محمد عقیل نے انیس کی مرثیہ نگاری کے بعض اہم نکات کو اجاگر کرتے ہوئے مشرقی تنقید اور مغربی تنقیدات کے مابین فرق کو مدلل اور مفصل طور پر بیان کیا ہے۔ وہ مغربی انتقادیات کے معترف تو ہیں لیکن مغرب پرستی کو مستحسن نہیں سمجھتے۔ مرثیوں کے مطالعے کے دوران وہ مشرقی اقدار کی تلاش مرثیوں میں کرتے ہیں۔ وہ مرثیوں کو ان کی شان نزول، تاریخی تہذیبی اور ثقافتی فنی عمل تخلیق کے پس منظر میں پرکھتے ہیں۔

سید محمد عقیل ادب پاروں کو سائنٹفک نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ ادبا و شعرا کے سیاسی و سماجی شعور کو اہمیت دیتے ہیں۔ اور Commitment کو ادیبوں کے لئے لازمی تصور کرتے ہیں۔ وہ ادب کے

مطالعے کے لئے معاشی حالات عصری روایات اور تہذیب کے تقاضوں کی آگہی کو ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ ایک مثبت سوچ اور علم و آگہی سے آشنا نقاد ہیں وہ Experiment کے نام پر اول جلول حرکتوں کو بے معنی اور لغو مانتے ہیں۔ وہ اپنی فکر اور مزاج و آہنگ کے اعتبار سے اردو کے جدید عمرانی نقادوں میں نمایاں حیثیت کے حامل نقاد ہیں۔ ان کی خصوصیات کی بابت محمد حسن نے لکھا ہے:

> ''پچھلے پندرہ برسوں میں اردو تنقید کے عمرانی دبستان میں شاید عقیل صاحب کا نام زیادہ نمایاں ہوا ہے۔ کیونکہ وہ چند عمرانی نقادوں میں ہیں جنہوں نے دور حاضر کے مسائل سے اجتناب کرنے سے انکار کیا اور اپنے طور پر نئے ادبی مزاج و منہاج کا بے باکانہ جائزہ لیتے رہے اس کے لئے سختیاں بھی اٹھائیں کڑیاں بھی جھیلیں، برا بھلا بھی سنا مگر اپنی بصیرت کو اپنائے رکھا اور فیشن اور فارمولے کے طوفان میں بھی ان کے قدم ڈگمگا نہ سکے۔''[1]

محمد عقیل اردو فکشن اور شاعری کی تنقید پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ جبکہ ان کی تنقید کو بالخصوص شاعری کی تنقید کہا جاتا ہے۔ لیکن جدید ناول کا فن، فکشن پر ان کی عمدہ تنقید کی بہترین مثال ہے۔ یہاں بھی ان کے یہاں تنقیدی بصیرت اور مخصوص طرز فکر اور طرز تنقید کا سراغ ملتا ہے۔ فکشن کی تنقید ہو یا شاعری کی

---

[1] عصری ادب۔ مدیر محمد حسن (تبصرہ) اکتوبر ۱۹۸۰۔ جنوری۔ اپریل۔ ۱۹۸۱۔ ص۔ ۲۲۹

ہر جگہ سید محمد عقیل کے یہاں شعور کی پختگی اور اعتدال وتوازن کی خصوصیت نظر آتی ہے۔ وہ ترقی پسندی کو ایک بہت ہی کارآمد اور تعمیری تصور کرتے ہیں۔ اور اسی نظریے کو عملی طور پر اپنی تنقیدی تحریروں میں برتتے ہیں۔ وہ مارکسی نقادوں کے یہاں انتہا پسندی اور شدت بیان سے نالاں ہیں۔ وہ اس طرز تنقید کو بہت ہی متانت اور سنجیدگی کی شے تصور کرتے ہیں۔ یہاں غالباً ان کا اشارہ ان متشدد مارکسی نقادوں اور ادیبوں کی طرف ہے جو روایتی ادب اور ماضی کے فن کاروں کو برا بھلا کہتے ہیں اور انکے ادب پاروں کو دریا برد کرنے کا فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ وہ اس سلسلے میں اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے اپنی ''نئی فکریں'' میں لکھتے ہیں:

> ''ترقی پسندی نہ بیہودگی سکھاتی ہے نہ بدتمیزی، زبان و بیان، محاوروں سے انحراف نہ لامذہبیت کی تلقین کرتی ہے۔ نہ کسی قسم کی کجروی اس کا مشرب ہے، اگر کوئی انفرادی طور پر ایسا کرتا ہے تو وہ خود اس کا ذمہ دار ہے۔''[1]

محولہ اقتباس سے سید محمد عقیل کے مزاج کے متعلق جانکاری ہوتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ترقی پسند تنقید کو تاریخی، سماجی اور تہذیبی روایتوں سے ہم رشتہ دیکھنا چاہتے ہیں کیونکہ سماج اور تاریخ کے شعور کے بغیر ادب پارہ نہ افادی ہوسکتا ہے اور نہ ہی Relevent ہوسکتا ہے۔

---

[1] تنقید اور عصری آگہی۔ سید محمد عقیل رضوی۔ انجمن تہذیب نو پبلی کیشنز ڈویژن، الہ آباد، ۷۶۔ ص۔ ۵۶۔۵۵

ان کے مطابق:

''اگر کوئی نقاد ادب کے مطالعے میں تاریخی اور سماجی قوتوں کو نظر انداز کر دیتا ہے اور اس سے محض لطف اندوز ہونا اپنا مقصد بنالیتا ہے تو ایسا نقاد ادب کی روح تک رسائی نہیں حاصل کر سکتا۔ ان کے یہاں ادب کے سماجی اور تاریخی رشتے کی اہمیت کا احساس اس لئے ہے کہ ان کے نزدیک ادیب اپنے گردو پیش کے خارجی ماحول، سماجی وتہذیبی حالات، سیاسی اور معاشی اتار چڑھاؤ سے متاثر ہوتا ہے ان کا خیال ہے کہ معاشی بحران سیاسی کشمکش اور ابتلا ادیب وفنکار پر بھی اثر ڈالتے ہیں۔ ادیب پر جو ردعمل اس کے گردوپیش سے ہوتا ہے وہ اس کی فکر کا جزو بنتا جاتا ہے۔ اور یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کی تحریر وتقریر، اس کے فکر کی پرواز، اس کے اقدام، اس کی جمالیات، یہاں تک کہ اس کے ذہن کا ایجاب وقبول، انکار اور لاتعلقی میں یہ اثرات منعکس نہ ہو۔ ادیب کے اظہار کی دنیا اس کے گردوپیش کی ہی دنیا ہے۔''[1]

سید محمد عقیل حساس اور منطقی مزاج رکھنے والے نقاد ہیں۔ وہ مارکسی تنقید کے نام پر ہونے والی منفی

سرگرمیوں کواس نظریے کے منافی سمجھتے ہیں۔ وہ احتشام حسین کی طرح جمالیات کا رشتہ مارکسی نقطہ نظر سے استوار کرتے ہیں اور اپنے معاصر نقادوں کی ذہن سازی بھی کرتے ہیں کہ وہ ان خطوط پر چلنے کی کوشش کریں۔ ان کے مطابق جمالیاتی قدر، قدر معین کی حیثیت نہیں رکھتی ہر ادیب اور شاعر ادب کی تاریخ میں اس تغیر وتبدل کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

وہ اردو کی جدید شاعری اور بالخصوص غزل کی شاعری کے متعلق اپنے واضح خیالات پیش کرتے ہیں۔ وہ غیر ضروری علامت پسندی اور تجربات کے طومار سے کبیدہ خاطر ہیں۔ اس ضمن میں پروفیسر محمد حسن نے لکھا ہے:

> ''سید محمد عقیل رضوی کا تنقیدی نقطہ نظر تاریخی اور سماجی ہے وہ ادب و تنقید کا تجزیہ کرتے وقت اس عہد کے تاریخی، سماجی اور تہذیبی اسباب و عوامل پر نظر رکھتے ہیں۔ جس عہد میں وہ ادب وتنقید وجود میں آیا۔ ان کی نگاہ زندگی کے بدلتے ہوئے اقدار اور سماجی شعور اور اس عہد کے نظریات و تصورات کی تبدیلی اور شکست وریخت کے نتیجوں پر ہوئی ہے۔ انہیں بدلتے ہوئے جمالیاتی شعور کا بھی احساس رہتا ہے۔ وہ ادب میں کسی نہ کسی نظریہ یا فلسفہ حیات کی جستجو کرتے ہیں۔ وہ ادیب کے رویے تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ یہ ضرور دیکھتے ہیں کہ ادیب کی وابستگی کس نظریے سے

ہے۔ترسیل وابلاغ میں کس حدتک کامیاب ہے۔انہیں تنقیدی نظریات کی روشنی میں عقیل رضوی نے اردو کی جدید شاعری بالخصوص غزل کی طرف خاص طور سے توجہ دی ہے۔آزادی کے بعد غزل میں جو نئے نئے تجربات کئے جارہے ہیں ان میں بعض فیشن اور فارمولے تک ہی محدود ہیں۔محمد عقیل رضوی کی نظر ان پر ہے۔انہیں غزل میں ''بے کلچری'' انداز نظر میں ناہمواری اور لایعنیت کا احساس ہوتا ہے۔اس کا سبب ان کے نزدیک جدید غزل گو کے یہاں کلچر اور روایت سے ناواقفیت ہے۔اس کا رشتہ روایت سے کٹ گیا اور وہ انفرادیت کے خول اور شخصی تجربوں میں بند گیا''[1]

''اردو کے جدید شعرا اس بات میں زیادہ کوشاں ہیں کہ وہ ایسی ایسی باتیں پیش کریں جو ان کیلئے نئے نئے تجربوں سے زیادہ بوالعجبیوں کی شکل میں نظر آئیں۔گہری اور تہہ دار باتیں کہنے اور نئے اسالیب کے چکر میں پھنس کر اس نے اپنے قاری سے بالکل منھ موڑ لیا ہے۔''[2]

---

[1] جدید اردو تنقید۔اصول ونظریات۔شارب ردولوی۔ص۔۳۹۱

[2] عصری ادب (مدیر محمد حسن) جدید غزل۔مضمون۔محمد حسن شمارہ۔۸۔ص۔۳۶

محمد عقیل رضوی خواہ شاعری ہو یا فکشن ہو اس کی تنقید کے دوران پس منظر اور روایت کو کبھی فراموش نہیں کرتے۔ وہ ادب کے ہر Experiment کی پشت پر تہذیب اور روایت کی موجودگی کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ وہ اس لئے کہ تہذیب اور روایت سے منحرف کوئی بھی تجربہ ہوا میں معلق ہوتا ہے۔

اردو کے ترقی پسند ناقدین میں وہ ان معنوں میں منفرد اور ممتاز ہیں کہ وہ کسی فیشن اور دکھاوے کی چیز کی طرف کبھی متوجہ نہیں ہوئے۔ اور ایسے تمام مصنوعی اور نام نہاد تجربوں کی مخالفت کی جو ادب کے جوہر کو ماند کرتے ہیں وہ اپنے اس نظریے کی حمایت بہت ہی وضاحت اور صراحت کے ساتھ کرتے ہیں۔

پروفیسر علی احمد فاطمی نے ان کی اس خصوصیت کے متعلق اظہار خیال کیا ہے پیش ہے اخیر میں ان کا یہ اقتباس:

> ''معدودے چند نقادوں اور دانشوروں میں سے ہیں جہاں علم اور حصول علم ان کا اوڑھنا بچھونا ہے اور جو ادب کو میکانکی انداز سے دیکھنے کے بجائے معروضی اور حقیقی انداز سے دیکھنے اور پرکھنے کے قائل ہیں انہوں نے پرانے مکتب فکر سے بہت کچھ حاصل تو کیا لیکن نئے ماحول اور نئے تناظر میں ترقی پسند تنقید کو کچھ اس طرح پیش کیا جو زیادہ قابل قبول ہوئی لیکن اس کے باوجود ان کے کچھ تحفظات ہیں جن سے باہر نکل آنا آسان نہیں۔ تاہم وہ نئے ادب اور نئے ادیبوں کو خلوص اور توجہ سے پڑھتے ہیں۔ اور اس میں

نئی سماجی زندگی کے عناصر تلاش کرتے ہیں ..... تاریخ تہذیب اور معاشرے ان کے مطالعے کے محبوب موضوعات ہیں۔ وہ اپنے تنقیدی رویے میں مارکسی اور سماجی طرز تنقید کے حامل ہیں۔''[1]

☆

---

[1] ترقی پسند ادب کے معمار۔ بحوالہ قمر رئیس (ترتیب) ص۔ ۶۵۔۲۶۴

اختتامیہ

ادب میں تنقید کا آغاز چوتھی صدی (ق۔م) میں افلاطون اور اس کے شاگرد ارسطو کے نظریات سے ہوا۔ افلاطون نے اپنی اہم ترین تصنیف جمہوریت Republic میں ادب اور آرٹ کو لایعنی شے قرار دیا۔ اور شاعر ادیبوں کو محض نقال گردانا۔ اس نقالی کو جمہوریہ کے لئے مضر قرار دیا۔ اس لئے اس نے شعرا و ادبا کو اپنی ریاست سے نکال باہر کیا۔ لیکن آگے چل کر اس کے شاگرد ارسطو نے اس سے اختلاف کیا۔ اس نے ادب کی وکالت کرتے ہوئے نقالی میں بھی ہنر مدنی کو ثابت کیا اور ادب کو سماج اور معاشرے کیلئے لازمی قرار دیا۔

صحیح معنوں میں تنقیدی مزاج و آہنگ کا آغاز افلاطون اور ارسطو کے خیالات سے ہی ہوتا ہے۔ آگے چل کر مغربی اور مشرقی ناقدین نے ادب پاروں کی افہام و تفہیم کیلئے تنقید کے کئی دبستان قائم کئے اور اپنے اپنے نقطہ نظر اور تھیوریز کے ذریعے تنقید کے نئے نئے گوشے پیدا کئے۔ ظاہر ان تمام دبستانوں کا مقصد صرف ایک تھا اور وہ تھا ادب کا تجزیہ یعنی اس کے عیوب و محاسن کو دیکھنا اور پرکھنا۔ ان دبستانوں میں سائنٹفک تنقید، جمالیاتی تنقید، تاثراتی تنقید، ہیئتی تنقید، نفسیاتی تنقید، مارکسی تنقید، ساختیاتی تنقید، وغیرہ

خاص ہیں۔اردو میں مارکسی تنقید ہی ذراسی تبدیلی کے ساتھ ترقی پسند تنقید کے نام سے موسوم ہوئی۔

ترقی پسند تنقید کی بنیاد یوں تو لندن میں سجاد ظہیر اوران کے احباب کے ذریعے رکھی گئی۔لیکن ہندستان میں غدر اوراس کے بعد کی شکست وریخت نے سرسید اوران کے رفقا کو متاثر کیا اور علی گڑھ تحریک سامنے آئی۔اس لئے اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ترقی پسند تحریک علی گڑھ تحریک کے بطن سے ہی پیدا ہوئی۔ بہرحال ان دونوں باضابطہ تحریکوں نے جس طرح اردو زبان وادب کو بڑے پیمان پر متاثر کیا اس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ترقی پسند تحریک کا براہ راست تعلق فن کار اور فن پاروں سے تھا۔لیکن اس اختصاص کے ساتھ کہ ادب میں سیاسی، سماجی اور معاشی صورت حال کی ترجمانی کو اولیت حاصل ہو اور ادب کو زندگی کا سچا آئینہ بنایا جائے۔جس طرح علی گڑھ تحریک کے آغاز کا اپنا پس منظر تھا اسی طرح ترقی پسند تحریک کی ابتدا کا بھی واضح پس منظر تھا۔دنیا بہت برق رفتاری سے تبدیل ہورہی تھی فرانس کا صنعتی انقلاب اورس کی بالشویک تحریک نے پرانے نظام کی جڑیں ہلادیں۔اس کے علاوہ نت نئی سائنسی ایجادات، نئے علوم و فنون اور مختلف نظریات وافکار نے بھی سماج اور ادب پر بڑا اثر ڈالا۔فرسودہ اور استحصالی نظام اور نئی تعمیری فکر کے درمیان تصادم اور کشمکش کا ماحول پیدا ہوا۔یورپ میں جب نئے افکار ونظریات کے خلاف علامتی جنگ شروع ہوئی تو اسی وقت روشن خیال ادیبوں کو یکجا ہونے کا موقع ملا۔اس یکجائی نے دنیا بھر کے مثبت اور تعمیر پسند ادبا شعرا کو ہم خیال بنایا اور انہوں نے انسانیت کی بقا کیلئے آواز اٹھائی۔ادیبوں کا ایک بڑا طبقہ ان منفی اور غاصبانہ قوتوں کے مقابل صف آرا ہوا جو استحصال، ظلم اور انصافی کے ذریعے سماج اور افراد

کے بنیادی حقوق کوغصب کرر ہا تھا۔ سماج کا پسماندہ طبقہ ان کے جنگل میں پھنسا کراہ رہا تھا۔ عالمی سطح پر تقریباً ہر بڑی زبان میں یہ رجحان بہت تیزی سے پھیل رہا تھا۔

سجاد ظہیر اور ان کے رفقانے اس بدلتے ہوئے عالمی ماحول کو شدت سے محسوس کیا اور ہندستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی داغ بیل پڑی۔ یہ تحریک صرف اردو کے لئے نہیں بلکہ ہندستان کی تمام علاقائی زبانوں کیلئے تھی اور اس کی حمایت کرنے والے تقریباً ہر زبان کے ادیب، دانش ور اور سیاسی شخصیات تھے۔ سجاد ظہیر نے ملک بھر کے دورے کئے۔ جلسے ہوئے۔ تحریک کا منشور تیار کیا گیا یہ کہا گیا کہ پرانے خیالات اور معتقدات کی بنیادیں ہل چکی ہیں اور ایک نیا سورج طلوع ہو رہا ہے۔ اس لئے ہندستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندستانی زندگی میں ہونے والی تبدیلیوں کو محسوس کریں اور ملک کی ترقی میں معاون بنیں۔ زندگی کی حقیقت سے فرار حاصل کر کے رہبانیت اور بھگتی کی پناہ میں جا چھپنا سماج اور فرد کے لئے سم قاتل ہے۔ آج جذبات کی نمائش عام ہے۔ عقل وخرد کو ادبا فراموش کر چکے ہیں۔

ترقی پسند مصنفین نے اپنے مقاصد کا اعادہ کیا کہ ادب اور فنون کو پجاریوں پنڈتوں اور دوسرے قدامت پرستوں کی اجارہ داری سے نکال کر عوام کے قریب لانا چاہئے۔ انہیں زندگی اور واقعیت کا آئینہ دار بنانا چاہئے۔ جس سے ہم اپنا مستقبل روشن کر سکیں گے۔ ترقی پسندوں نے اس سے آگے بڑھ کر یہ بھی کہا کہ ہندستان کے نئے ادب کو ہماری موجودہ زندگی کی بنیادی حقیقتوں کا احترام کرنا چاہئے۔ اور ہماری بدحالی، پستی اور پسماندگی کو سمجھنا چاہئے اور ہم اسی وقت اپنے مسائل کو سمجھ سکیں گے جب

ہمارے اندر انقلابی روح پیدا ہوگی۔ اور ہم قدامت پسندوں اور رجعت پسند وں کے نظام کو مندہم کریں گے۔ سجاد ظہیر کی مساعی اور بڑی تعداد میں ادبا شعرا اور نقادوں کی کوششوں نے ہندستان بھر کے نئے پرانے ادیبوں کو متاثر کیا۔ اس تحریک کو پریم چند اقبال اور جواہر لعل نہرو جیسی شخصیات کی حمایت حاصل تھی۔ تحریک کے مقاصد کو سراہتے ہوئے۔ پریم چند نے اپنا تاریخی خطبہ پیش کیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ اب فن کا معیار بدلنا ہوگا۔ پرانے راستے کو چھوڑ کر نیا راستہ اپنانا ہوگا۔ اب وہ ادب کھرا مانا جائے گا جس میں تفکر، آزادی کا جذبہ، تعمیر کی روح، حسن کا جوہر اور اس کا التزام ہو جو ہماری زندگی کی حقیقتوں کا ترجمانہو جو ہمیں سلائے نہیں بلکہ بیدار کرے۔ ظاہر ہے پریم چند کا یہ خطبہ تمام روایتی خیالات ادبی میلانات کے خلاف تھا۔ اور ترقی پسند تحریک کیلئے ایک نسخہ کیمیا تھا۔ تحریک کے مقاصد کی تشہیر جہاں علمی طور پر عروج پر تھی وہیں تحریری طور پر کئی معروف ادبا اس کی حمایت میں مضامین تحریر کر رہے تھے۔ ان مضامین میں متفقہ طور پر رجعت پسند ادیبوں شاعروں کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ فراق گورکھپوری نے اپنے مضمون میں ہندستان کی تہذبی اور تمدنی صورتحال کا جائزہ پیش کیا۔ ساتھ ہی یہ واضح کیا کہ ہندستان کی دیگر زبانوں میں نئے ادبی خیالات اور نظریات تحریک کے ہی مرہون منت ہیں۔ اور یہ تحریک ہمارے ملک کو نیا رخ دینے میں سب سے زیادہ اہم رول ادا کرے گی۔ فراق کے علاوہ حسرت موہانی، محمود الظفر، وغیرہ نے بھی اپنے خیالات کو واضح کیا۔ اس تحریک کی سب سے اہم خصوصیت سماج اور عوام کی فلاح و بہبود تھی ترقی پسند اپنی اسی سوچ کے تحت ادب کو آگے لے جانا چاہتے تھے اور اس ضمن میں اپنے مسلسل

جلسے جلوسوں اور لٹریچر کے ذریعہ انہوں نے ادب کی سمت و رفتار کو اپنے مطابق کرنا چاہا۔ ان کے جذب کی صداقت اور ان کی پر جوش عملی سرگرمیوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہاں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ادب، ادب ہوتا ہے۔ ادب کے کچھ اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ اس کی اپنی نزاکتیں اور باریکیاں ہوتی ہیں۔ اگر ان کو رد کر کے ادب تخلیق کیا جائے تو وہ ادب نہیں رہتا کچھ اور ہو جاتا ہے۔

ترقی پسند تحریک کے نظریاتی مباحث پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی افہام و تفہیم میں جہاں ایک طرف انتہا پسند ناقدن سرگرم تھے وہیں دوسری طرف اعتدال پسند اور متوازن مزاج کے بھی ادبا اور دانشور متحرک تھے۔ مارکس کے نظریے جدلیاتی مادیت(Dialectical Materialism) کے حامیوں نے اس کو اپنے اپنے طور پر لیا۔ واضح ہو کہ مارکس کے اس نظریے کا براہ راست تعلق ادب سے نہیں تھا۔ یہ ایک ایسا نظریہ تھا جس کی پشت پر صدیوں کی جبر و ظلم سے بھری تاریخ تھی۔ اور اسی کے رد عمل میں سماج اور سرمایہ دار طبقے کو موضوع بنایا گیا تھا۔ مارکس ادب کو سماج کا ہی حصہ تصور کرتا تھا۔ اور ادب میں فنی محاسن کا قائل تھا۔ لیکن اختر حسین رائے پوری اور ظ۔ انصاری جیسے ناقدین نے فن اور فنی محاسن کو اور بالخصوص ماضی کے تمام ادبی ورثے کو صرف اس لئے مسترد کر دیا کہ وہ خوش حال ماحول اور خوش طبقے کے پروردہ اور عکس تھے۔ مارکسی تنقید نگاروں یعنی ترقی پسند نقادوں پر اعتراضات ہوئے۔ ان کے مقابل میں خود سجاد ظہیر، مجنوں گورکھپوری، احتشام حسین اور قمر رئیس جیسے ناقدوں نے لکھا اور پھر ایک نئی بحث سامنے آئی کہ مارکس، لینن اور ماوزے ننگ جبکہ ادب پاروں کو مسخ کرنے یا ان کا حسن

غارت کرنے کے متعلق کچھ نہیں کہا تو پھر ان کے تابعین نے فنی محاسن اور ماضی کے ادب کو کیوں رد کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔

مارکسی تنقید کے پیش نظر یہ ایک ایسی بحث ہے جو ہر جگہ Stand دکھائی دیتی ہے۔ اور ہر جگہ ترقی پسند ناقدین کی انتہا پسندی اور ادعائیت سامنے آتی ہے۔ ماوزے ننگ کے حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر نے اس بات کی توضیح کی ہے کہ ترقی پسند ناقدین نے ادب کے افادی کاز کو نقصان پہنچایا ہے۔ اور قدیم ادب اور متقدمین کی تنقید اور تنقیص صرف اس لئے کرتے ہیں کہ وہ اپنے فن پاروں میں فن کو اولیت دیتے ہیں اور اپنے عہد کو Focus کرتے ہیں۔ اور جو عہد امرا اور رؤسا کی حرکات وسکنات سے زیادہ متعلق تھا۔

آغاز میں یعنی سجاد ظہیر کی لندن سے آمد کے وقت ترقی پسند تحریک کے تنقیدی اور نظری مباحث کچھ اور تھے۔ لیکن آگے چل کر یہ کچھ اور ہو گئے۔ اس کا احساس سب سے پہلے خالص ادبا شعرا کو ہوا جو سیاسی ذہن نہیں رکھتے تھے۔ لیکن جب تک احساس ہوتا بہت دیر ہو چکی تھی۔ ترقی پسند ناقدوں جن میں زیادہ تر مارکس کے سیاسی نظریے پر اکتفا کرتے تھے انہوں نے جیسا کہ گزشتہ سطور میں عرض کیا گیا کہ اردو کے تمام قدیم ادب پاروں مثلاً مثنویوں داستانوں، قصیدوں اور غزلوں کو مذموم قرار دیا اور انہیں دریا برد کر دینے پر آمادہ ہو گئے آگے چل کر یہاں تک ہوا کہ علامہ اقبال کو ''اسلامی فاشسٹ'' تک کہا گیا اکبر کو قدامت پرست اور سرسید و حالی کو بھی ایسے ہی خطابات سے نوازا گیا۔ ان کے جواب میں معتدل اور متوازن مزاج وآہنگ کے ناقدین میں جیسا کہ کہا گیا کہ مجنوں گورکھپوری، عزیز احمد، احتشام حسین، قمر رئیس، ممتاز حسین،

محمد حسن اور سید محمد عقیل نے کل اور آج کو ملا کر ادب اور ادیبوں کی اہمیت کو تسلیم کیا۔ ان کے یہاں عصری ادب کی نئی جہات کو تلاش کرنے کا عمل شروع ہوا۔ نظیر اکبر آبادی کی عظمت کی بازیافت انہیں کوششوں کا نتیجہ تھی اور اسے اردو کا پہلا با قاعدہ عوامی شاعر مانا گیا۔

معتدل اور متوازن مزاج رکھنے والے ناقدین کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ مارکسی نظریے کے کئی پہلوؤں سے اختلاف رکھتے تھے۔ ان میں بعض نقاد صرف اس حد تک اشتراکی اور مارکسی تھے کہ سیاست کے اثرات ادب پر پڑتے ہیں۔ لیکن کسی خاص سیاسی نظریے کا پرچار اور تشہیر سے وہ انکار کرتے ہیں۔ وہ نقاد کو زندگی کا حقیقی ترجمان اور ادب کو زندگی کا آئینہ سمجھتے ہیں۔ وہ ادب کو سماجی فریضہ قرار دیتے ہیں اور ادب ان کے نزدیک تاریخی ارتقا سے الگ کوئی چیز نہیں۔ وہ ادب کے افادی پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کرتے اور ان ہی میں سے اختر انصاری جیسے نقاد صاف طور پر ادب کو پروپگنڈہ نہیں قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح ایک دوسرے غیر مارکسی نقاد عزیز احمد اس کو ادب کا ترجمان اور نقاد سمجھتے ہوئے بھی اشتراکی حقیقت نگاری کو بھی قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ کیونکہ ان کے نظریے کے مطابق ادب اور فن کو آزاد فضا میں سانس لینا چاہئے اور اشتراکی حقیقت چونکہ ادب اور ادیب کو پابند سلاسل کرتی ہے اس لئے اشتراکی حقیقت نگاری کا فنی طریقہ کار اور نظریہ ان کی نگاہ میں درخور اعتنا نہیں ٹھہرتا۔ وہ دیگر مارکسی نقادوں کی طرح ادب کی سماجی اہمیت کے قائل ہوتے ہوئے بھی ادب کے ذریعے اشتراکی اصولوں کے پرچار کو اپنا نصب العین نہیں بناتے۔ ڈاکٹر تنویر خانم کے محولہ اقتباس کی روشنی میں ہم وحید اختر، باقر مہدی،

تبسم کاشمیری، محمد علی صدیقی، آغا سہیل، وارث علوی اور فضیل جعفری کا ذکر بھی کر سکتے ہیں۔ یہ ناقدین مارکسی نہیں ہیں لیکن انہوں نے جا بجا ترقی پسند تحریک کے نظریہ فن سے غیر اعلانیہ طور پر استفادہ کیا ہے اور جہاں ضروری معلوم ہوا ہے انہوں نے اختلاف کی راہ بھی کھلی رکھی ہے۔

مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو میں ترقی پسند تحریک کا آغاز اور ارتقا ایک مثبت اور تعمیری ذہن کے ساتھ ہوا تھا اور بہت کم وقت میں یہ مقبول بھی ہوا۔ لیکن دن بہ دن اس کی مقبولیت میں کمی آتی گئی۔ چونکہ ترقی پسندی اردو روایت اور تہذیب کے منافی تھی اس لئے یہ زیادہ دن تک اپنا اثر قائم نہ رکھ سکی۔ حالانکہ مزدور، محنت کش اور مستحصل طبقہ یہاں بھی تھا۔ زیادہ اور جبر کا نظام یہاں بھی رائج تھا۔ لیکن مارکسی نقادوں نے جس طرح مارکس، لینن اور ماوزے تنگ کے نظریات کو اپنے مزاج کے مطابق توڑ مروڑ کر عوام پر تھوپا اسے عوام نے رفتہ رفتہ رد کر دیا۔ اردو میں قدیم ادب پارے آج بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ماضی کو آج بھی لوگ سینے سے لگائے رکھتے ہیں۔ انتہا پسند مارکسی نقادوں نے اکثریت کے اس مزاج کو نہیں سمجھا اور انہیں چیزوں پر حملے شروع کر دئے۔ نتیجہ ظاہر تھا جو ہونا تھا وہ ہوا۔ لیکن اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ترقی پسند تحریک نے اردو کی تمام اصناف بشمول تنقید بڑے پیمانے پر متاثر کیا اور جو گھسا پٹا، موضوع، اسلوب اور انداز تھا اس میں تبدیلی آئی۔ اور اس مثبت تبدیلی کے لئے ترقی پسند ادب اور تنقید کو کبھی فراموش نہیں کی جا سکتا۔

☆

کتابیات

ادب اور انقلاب	اختر حسین رائے پوری	فاروقی پریس، بمبئی	ب۔ت
ادب اور ابہام	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید	نیشنل بک ہاؤس، حیدر آباد	۱۹۷۹ء
ادب اور تنقید	اسلوب احمد انصاری	سنگم پریس، الٰہ آباد	۱۹۶۸ء
ادبی سماجیات	محمد حسن	مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی	۱۹۸۳ء
ادبی تنقید	ڈاکٹر محمد حسن	ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ	۱۹۵۴ء
ادبی تنقید کے چند مسائل	اسلوب احمد انصاری	آزاد کتاب گھر، دہلی	ب۔ت
اردو ادب کے رجحانات پر ایک نظر	ڈاکٹر عبد العلیم	۔ ۔ ۔	۔ ۔
اردو تنقید اور قمر رئیس	سلیمان اطہر جاوید	(مشمولہ قمر رئیس ایک زندگی)	
اردو تنقید پر ایک نظر	کلیم الدین احمد	بک امپوریم، پٹنہ	۲۰۰۱ء
اردو تنقید کے معمار	ایم حبیب خان (مرتب)	انڈین بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۶۵ء
اردو کے نئے تنقیدی دبستان	ڈاکٹر نیلوفر مرتضی	۔ ۔ ۔	۲۹۹۵ء
اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمٰن اعظمی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی	۱۹۶۶ء

اردو میں ترقی پسند تنقید	ڈاکٹر مخمور صدری	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۰۸ء
اردو ہندی، ہندستانی	سجاد ظہیر	کتب پبلشرز لمٹیڈ، بمبئی	ـ ـ
اشارات تنقید	سید عبداللہ	جمال پریس، دہلی	ب۔ت
افادی ادب	اختر انصاری	آزاد کتاب گھر، دہلی	۱۹۵۹ء
افادات مہدی	مہدی افادی	سلطان بک ڈپو، حیدرآباد	۱۹۵۶ء
ادب کے مادّی نظریے	ظہیر کاشمیری	کلاسیک پبلی کیشن، لاہور	۱۹۷۵ء
انتقادات۔جلد دوم	نیاز فتح پوری	برقی پریس، حیدرآباد	۱۹۴۴ء
پاکستان میں اردو تنقید کے پچاس سال	شہزاد منظر	منظر پبلی کیشنز، گلشن اقبال، کراچی	۱۹۹۶ء
پردیسی کے خطوط	مجنوں گورکھپوری	ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ	۱۹۵۷ء
ترقی پسند ادب	عزیز احمد	ادارہ اشاعت اردو، حیدرآباد	۱۹۴۲ء
ترقی پسند ادب	علی سردار جعفری	انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ	۱۹۵۱ء
ترقی پسند تحریک۔سفر در سفر	پروفیسر علی احمد فاطمی	ادارہ نیا سفر۔الہ آباد	۲۰۰۶ء
ترقی پسند تحریک اور قمر رئیس	محمد شہاب الدین	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۰۴ء
ترقی پسند تنقید	تنویر خانم	تخلیق کدہ۔شاہ عالم گیٹ، لاہور	۱۹۸۴ء
ترقی پسند تنقید کا ارتقا اور احتشام حسین	شمیمہ بیگم	اردو اکیڈمی، سندھ کراچی	۱۹۸۷ء

تلاش وتوازن	قمر رئیس	خرام پبلی کیشنز، دہلی	۱۹۶۸ء
تنقید اور اصول تنقید	عبادت بریلوی	ادارۂ ادب وتنقید، لاہور	۱۹۸۴ء
تنقید اور انداز نظر	سیدہ جعفر	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	۱۹۴۹ء
تنقید اور عصری آگہی	سید محمد عقیل	انجمن تہذیب نو، الہ آباد	۱۹۷۶ء
تنقیدی اصول اور نظریے	حامد اللہ افسر	انوار بک ڈپو، لکھنو	۱۹۵۴ء
تنقیدی جائزے	احتشام حسین	رزاقی مشین پریس حیدر آباد	۱۹۴۴ء
تنقیدی دبستان	سلیم اختر	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۸۲ء
تنقیدی حاشیے	آل احمد سرور	ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ	۱۹۴۲ء
تنقیدی مسائل	ریاض احمد	استقلال پریس لاہور	۱۹۶۱ء
تنقیدی مطالعے	شارب ردولوی	لکھنؤ	۱۹۸۴ء
تنقیدی نظریات	پروفیسر احتشام حسین	ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ	۱۹۶۶ء
جدید اردو تنقید: اصول ونظریات	ڈاکٹر شارب ردولوی	اتر پردیش اردو اکادمی۔ لکھنؤ	۱۹۸۱ء
ذکر حافظ	سجاد ظہیر	انجمن ترقی اردو (ہند)، علی گڑھ	۱۹۵۶ء
سماجی تنقید اور تنقیدی عمل	محمد عقیل رضوی	تہذیب نو پبلی کیشنز، الہ آباد	۱۹۸۰ء
شناسا چہرے	محمد حسن	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۷۹ء

عرض ہنر	محمد حسن	نصرت پبلیشرز، لکھنؤ	۱۹۷۷ء
فن تنقید اور اردو تنقید نگاری	نورالحسن نقوی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۰۱ء
قمر رئیس کی علمی و ادبی خدمات (تنقیدی جائزہ)	مسرت جہاں	سلور لائن پرنٹرز، حیدرآباد	۲۰۰۴ء
مارکسزم اور ادب	ہندوستانی زبانوں کا مرکز	جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی	۱۹۸۱ء
محاسن کلام غالب	عبدالرحمٰن بجنوری	انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد	۱۹۲۵ء
مراسلات رسوا	مرزا ہادی رسوا/مرتبہ محمد حسن	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۶۱ء
مقدمہ شعر و شاعری	الطاف حسین حالی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۷۷ء
نئے تنقیدی گوشے	ممتاز حسین	آزاد کتاب گھر، دہلی	۱۹۶۴ء
نئی فکریں	سید محمد عقیل رضوی	انجمن تہذیب نو پبلی کیشنز، الہ آباد	۱۹۸۰ء

1. Ashort history of modern Criticism Vol. II Janathan Cape, London,.1970

2. English literary criticism: 17th & 18th century by Dr. Arkins

3. Frontiers of criticism. T.S. Eliot

4. Life and literature. Maxim Gorkey

5. Preface to the Renaissnce by Walter Peter, London.1928

6. Principles of criticism by I.A. Richards London, 1970

7. The firstline of the Vol. of work Endymion, 1818 by Keats

8. The Critics of artist intentions by Oscar Wilde,London,1947

9. Literary criticism. A short history by William K.Winsatt & Cleanth Brooks

10. Literary Criticism by Ramawadh Dwidi & Vikramaditya Raj (Introduction)

11. Macvlajs Essays on Milton, Edited by Harinath Dacca 1902

رسائل

آج کل (ماہنامہ)	دہلی	جولائی	۲۰۱۰ء
الفاظ (دوماہی)	علی گڑھ	جنوری	۱۹۸۳ء
ایوان اردو (ماہنامہ)	دہلی	مئی	۱۹۸۸ء
شاعر (ماہنامہ)	ممبئی		۱۹۶۷ء
شاعر (ماہنامہ)	ممبئی جلد: ۴۶، شمارہ: ۸۔۷		
شاہکار (احتشام حسین نمبر)	وارانسی	نومبر و دسمبر	۱۹۷۳ء
عالمی اردو ادب	دہلی، جلد۔ نمبر ۱۹		۲۰۰۱ء
عصری ادب	(مدیر محمد حسن)	جنوری، اپریل، اکتوبر	۱۹۸۰ء
کہسار (ماہنامہ)	بھاگلپور مناظر عاشق ہرگانوی	جنوری	۱۹۷۹ء
گفتگو	ممبئی، ترقی پسند ادب نمبر۔ سجاد ظہیر۔ یادیں		۱۹۸۰ء
ماہ نو	(اردو تنقید کے پچاس سال)	جنوری	۱۹۸۸ء
نئی نسلیں	کراچی	اکتوبر	۱۹۷۸ء
نیا ادب	لکھنو	جنوری۔ فروری	۱۹۴۱ء
نیا پیام (پندرہ روزہ)	لاہور،	اگست	۱۹۷۴ء

●●●